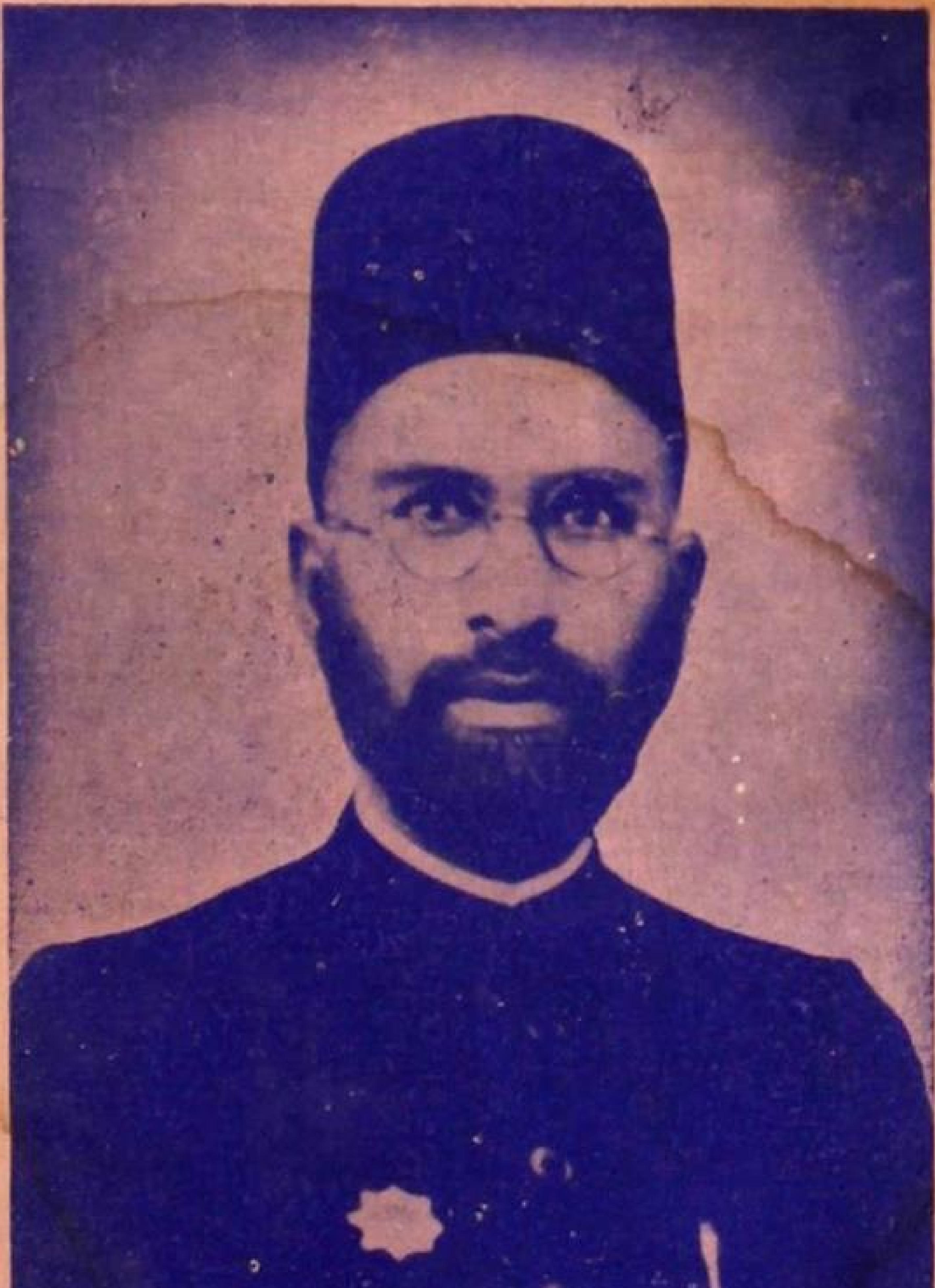


آپ بیتی

میں نے
کیا کھویا اور کیا پایا

لام قادر شرق بنگلوری

۳۰ نومبر ۱۹۶۰ء



غلام قادر شرقؔ بنگلوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

تمہید

میرے محترم بزرگ الحاج حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد و سکندرآباد کے فرزند اکبر الحاج سیٹھ علی محمد صاحب ایم۔ اے ایڈنبرا لنڈن کی خواہش اور اصرار پر میں نے اپنی "آپ بیتی" ایک موقع پر نماز جمعہ کے بعد احباب کی خدمت میں سنائی تھی جو کہ ایک سمع خراشی سے کم نہ تھی۔ لیکن احباب کے نزدیک وہ ایک دلچسپ اور ثمر احمدیت کا سبق آموز واقعہ ثابت ہوئی میں نہ عالم نہ فاضل نہ ادیب اور نہ مقرر۔ بلکہ ایک عامی الشان اور معمولی تاجر تھا۔ یہ محض احباب کی قدر افزائی تھی جو انھوں نے میری آپ بیتی پسند کی۔ نہ صرف پسند کی بلکہ مجبور کیا کہ میں اسے شائع بھی کروں۔ اور مکرم سیٹھ علی محمد صاحب کا اس قدر اصرار ہوا کہ میں ضرور ان حالات کو قلم بند کروں۔ جو بنگلور کی احمدیت کی تاریخ کا ایک

حصہ بھی بن سکیں اور میرے احمدیت سے بغلگیر ہونے کے سوال پر بھی روشنی ڈال سکیں میرے لئے یہ ناممکن ہوا کہ اُنکے جذبات محبت کی قدر نہ کروں۔ اِس لئے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اُسے پیش کرتا ہوں۔

مجھے احمدیت کی نعمت کیسے ملی؟

احمدیت یعنی حقیقی اسلام اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم الشان نعمت ہے وہ اپنے عاجز بندوں میں جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اس میں کسی کا زور نہیں چلتا۔

؎ ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یوں تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق سب ہی ہیں۔ اور سب پر اسکی ایک نظر ہے۔ لیکن بعض مواقع اور بعض مصالح ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی کنہہ کو پہنچنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ نہیں معلوم میرے والدین کی کونسی نیکی تھی جو میرے رب کو پسند آئی۔ یا میرے آباد اجداد میں کس کی یہ خواہش اور دعا ہوگی کہ اُنکی نسل بھی حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے غلاموں میں شامل ہو۔ بہرحال یہ اصل اور مستحکم بات ہے کہ مجھ میں کوئی ایسی خوبی نہ تھی جو احمدیت جیسی نعمت کو پا سکتی۔ ہاں یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جو مجھے گندے اعمالی اور پلید

عقائد سے کھینچ کر باہر لایا۔ اور حقیقی اسلام سے بہرہ ور کیا۔

آمدم بر سر مطلب

میں مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان ضرور کہلاتا تھا۔ لیکن مغز اسلام سے قطعی واقفیت نہ تھی۔ جس طرح وراثت میں پائے ہوئے مال کی قدر نہیں ہوتی اسی طرح وہ لوگ جو باپ دادا کی میراث میں اسلام پائے ہوں اُن کے لئے بقول شخصے ؎

گھر کی مُرغی دال برابر

اسلام کی کوئی قدر نہیں اور نہ وہ حقیقت اسلام سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔ یہی حال میرا تھا۔ دن رات لہو لعب و لغویات میں مستغرق تھا۔ شرارت ایزا رسانی بے ہودگی تو میرے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی۔ بلکہ بلاوجہ کسی پر ظلم کرنا یا کسی کی پگڑی اچھالنا جھگڑا فساد کرنا میرا ایک کارنمایان اور دلیرانہ اقدام سمجھا جاتا تھا۔ اور اُن بداعمالیوں کو میں اپنے احباب میں جو اسی قماش کے تھے بڑے فخر سے بیان کرتا تھا۔ یہ میری جاہلیت کی ایک ادنیٰ جھلک تھی رفتہ رفتہ مجھے شعر شاعری کا شوق ہوا۔ جبکہ میری شادی ہو کر دو تین سال ہوئے تھے میرا عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ بیس بائیس سال کی عمر تھی۔ طبیعت میں شوخی۔ شرارت۔ اُمنگ۔ ولولہ سب لوازم موجود تھے۔ اُس زمانہ

کی شاعری عاشق مزاج لوگوں کے لئے سازگار تھی۔ بیکاری کا مشغلہ یار آشناؤں کی صحبت پھر کیا تھا۔ جب کبھی دو چار ہم جنس جمع ہو جاتے تو اچھا خاصہ مشاعرہ شروع ہو جاتا۔ گرہ پر گرہ لگائی جاتی واہ واہ کا غلغلہ بلند ہوتا۔ لیکن یہ شاعری کچھ قاعدہ اور ضابطہ کی نہ تھی۔ محض بے ہودہ تک بندی تھی۔ ہوتے ہوتے یہ خیال آیا کہ بجائے اس بے قاعدہ و بے تکی شاعری کے اصول و قواعد سے آگاہی حاصل کیجائے۔ سبھوں نے اتفاق کیا اور ایک اچھے ماہر کی تلاش شروع ہوئی۔ خوبی قسمت کے ہماری تلاش میں کوئی اور ماہر فن ہاتھ نہ لگا۔ سوائے ایک شخص کے جو قادیانی کہلاتا تھا ہمیں مطلق خبر نہ تھی کہ قادیانی کیا ہوتے ہیں۔ لیکن بہرحال ہم اپنی شاعری کا علم حاصل کرنے کے لئے اُن کے پاس آنے جانے لگے۔ یہ قادیانی صاحب کا اسم گرامی ابو الخیر محمد عبدالحق تھا۔ جو نہ صرف بلند پایہ کے شاعر تھے بلکہ ایک جید عالم۔ خوشنویس اور تجربہ کار حکیم حاذق بھی تھے۔ علم تصوف میں بھی انکو کافی دخل تھا۔ جب ہم اُن کی خدمت میں پہنچے۔ اور عرض حال کیا تو فرمانے لگے کہ مجھے جو کچھ آتا ہے تمھیں سکھا دونگا۔ اور سچ مچ اُنہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا نہ صرف اُنھوں نے شاعری کے اسباق دیے بلکہ احمدیت کی حقیقت اور اسلام کا مغز بھی ہمیں سمجھایا۔ جیسا کہ آگے چلکر اس کی وضاحت ہو گی۔

ہم علم عروض کی کتابیں لیکر باقاعدہ اُنکی شاگردی میں داخل ہو گئے۔

اور چند روز بہت ہی پابندی کے ساتھ درس تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت سعدی علیہ رحمۃ کا ایک مصرع ہے۔

ع علم کندن میانِ دو پستان

اُس کا ترجمہ یہ ہے کہ علم ماں اور بیوی کے چھاتیوں کے درمیان ہے اُس کا بین السطور مطلب یہ ہے کہ طالب علمی کا زمانہ ایام رضاعت سے لیکر شادی تک محدود ہے۔ شادی سے پہلے جو کچھ اور جتنا کچھ علم حاصل ہو جائے ہوئے۔ اُس کے بعد علم کا حصول مشکل اور دشوار تر ہو جاتا ہے۔ میں اور میرے ساتھ جتنے دوست احباب تھے وہ سب کے سب شادی شدہ تھے۔ حصول علم کے مجاہدات کی کب تاب لا سکتے تھے۔ سب کے سب ایک ایک کر کے کھسک گئے۔ میں ایک ذرہ مستقل مزاجی سے لگا رہا اور چند روز فاعلاتُ فاعلاتُ فاعلات کی رٹ لگا کر اُکتا گیا۔ اب میری طبیعت بھی شاعری سے ہٹ کر خوشنویسی کی طرف آ گئی۔ میرے اُستاد مشفق کا ایک مطب تھا۔ اس مطب میں ایک طرف بیٹھکر میں خوشنویسی کی مشق کرنے لگا۔

حضرت مولوی صاحبؓ کے پاس اُن دنوں اخبار الحکم آیا کرتا تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ اُس اخبار کو پڑھنا تو کجا اُسے ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ مطب کا حال یہ تھا کہ وہاں جسمانی بیمار تو کم آیا کرتے تھے۔ لیکن آنے والوں میں اکثریت یہ ہوتی تھی کہ کوئی تو دہریہ ہے خدا تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت مانگتا ہے۔ کوئی مولوی آتا ہے۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حیات و وفات پر گفتگو کرتا ہے۔ کوئی آریہ آتا ہے تو وہ اپنے اصول کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ اور کوئی عیسائی آتا تو وہ الوہیت مسیح کا مسئلہ چھیڑتا۔ غرض قسما قسم کے لوگ آتے اور اپنے اپنے مذاق کی باتیں کرتے۔ ہمارے استاد محترم ہیں کہ ہر حیثیت سے اسلام کی برتری اور اس کے اصول کی فوقیت ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ اور یہ نہیں کہتے کہ بھائی جان یہ مطب ہے کوئی عارضہ ہے کوئی مرض ہے تو کہو تا میں علاج کروں۔ ہاں جو لوگ آتے وہ بیشک روحانی مریض ہوتے اور ہمارے مولوی صاحب ضرور اُنکا علاج کرتے اور ایسے ایسے عمدہ نسخہ جات تجویز کرتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے طرز استدلال اس قدر دلچسپ و دلکش ہوتا کہ ان کی باتیں سُنکر مخالف قائل ضرور ہو جاتا۔ اس طرح کے بحث و مباحثے تقریباً روز ہی ہوا کرتے تھے۔ اور میں ایک طرف بیٹھکر خاموش سُنا کرتا تھا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ ایک زبان ہو کر ایک ایسا اعتراض کرتے تھے جو اُن کے علم میں وہ بہت ہی مضبوط اور ناقابلِ جواب ہوتا تھا۔ مولوی صاحب نہایت سنجیدگی سے سنتے اور جواب دینا شروع کرتے تو درمیان میں بہت سے لوگ ایکدم جرح وقدح کی بوچھاڑ بھی کر دیتے تھے۔ لیکن ہمارے مولوی صاحب کو ذرا بھر گھبراہٹ نہوتی۔ وہ اپنے دلائل پہلے تو عقلی اور اسکی تائید میں نقلی دلائل بھی پیش کرتے کبھی قرآنی آیات

تلاوت فرماتے اور کبھی احادیث سے استدلال کرتے اور کبھی انجیل اور کتاب مقدس کے آیات سے استنباط فرماتے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا کہ انھیں غیر مذاہب کے معتقدات و مسلمات پر بھی ید طولیٰ حاصل ہے اور وہ اپنے مخاطب کو ایسے طور پر گھیر لیتے تھے کہ وہ آخر لاجواب ہو جاتا۔ گوش زدہ اثرے دارد۔ باوجود میرے اس ارادہ کے کہ میں اُن کا اثر مذہبی رنگ میں قبول نہ کرونگا۔ مجھ پر جادو ہونے لگا۔ اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ اُن دلائل کے ہتیاروں میں گھائل ہوا جا رہا ہوں۔ اور میرے لئے کوئی جائے فرار نہیں۔ بجز اس کے کہ میں اُن باتوں کو قبول کروں اور مان لوں۔ اخبار الحکم کو جسے میں ہاتھ لگانا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اُس میں بجائے فحش باتوں اور لغو اشتہارات کے جو اکثر دوسرے اخبارات میں درج رہتے ہیں۔ صرف قرآن و احادیث اور دینی باتیں ہی شایع ہوتی تھیں۔ دیکھ کر مجھے اسلام سے محبت اور اُسکی پاک تعلیم سے دلچسپی ہونے لگی۔ اور ساتھ ہی احمدیت کی صداقت بھی مجھ پر آشکار ہونے لگی۔ اُس کی پہلی وجہ تو حضرت مولوی صاحب کا کردار تھا جو میرا چشم دید تھا۔ اور دوسری وجہ وہ تعلیم تھی جو احمدیت کے اخبارات اور لٹریچر سے مجھے حاصل ہوتی رہتی تھی۔ پھر میں اخبار الحکم کے علاوہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے کتب اور سلسلہ کا لٹریچر بھی دیکھنے لگا۔ رفتہ رفتہ میری حالت بدلنے لگی۔ مجھ میں جو بداخلاقیاں و بدکرداریاں تھیں۔

اُن سے مجھے نفرت ہونے لگی۔ اور میں اُنھیں چھوڑتا گیا۔ اسی حالت میں چند روز اور گذرے مطالعہ کرتے اور غور کرتے کرتے مجھے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے دعاوی وغیرہ کے متعلق بھی انشرح صدر حاصل ہو گیا۔

ایک مبشر خواب اور بیعت

اُس زمانہ میں ایک شب میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں قادیان گیا ہوں وہاں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا ایک بڑا مکان پرانی طرز کا ہے۔ اس مکان کے باہر ایک چبوترہ ہے جس پر حضور لیٹے ہوئے ہیں۔ اور مجھے ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے پیر دابو۔ تعمیل حکم میں میں فوراً آپ کے پیر دابنے لگا ہوں اسی حالت میں نیند سے بیدار ہوا۔ اور مجھے ایسی خوشی ہوئی کہ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ صبح ہوتے ہی میں سب سے پہلے حضرت استاذی المکرم مولنا محمد عبدالحق صاحب رضؓ کے پاس گیا اور اپنا وہ خواب بیان کیا۔ وہ سن کر فرمانے لگے کہ یہ بہت ہی مبارک خواب ہے۔ اب تم فوراً بیعت کر لو۔ میں اسی وقت بیعت کا خط لکھکر حضور کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ حضور کی جانب سے ۲۹؍ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء میں جواب موصول ہوا۔ کہ تمہاری بیعت منظور کر لی گئی۔ وہ خط ابتک میرے پاس محفوظ ہے۔ جو یہ ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

بخدمت اخویم منشی غلام قادر صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ خط آپ کا حضرت (مرزا غلام احمد صاحب) کی خدمت میں پہنچ گیا۔ حضرت صاحب نے آپ کی درخواست بیعت قبول کی اور دعا فرمائی۔ نام آپ کا درج کردیا۔ چاہیئے کہ نمازوں کو سنوار کر ادا کریں۔ دعا استغفار مانگتے رہیں۔ تقویٰ طہارت میں کوشش کریں حسب استطاعت ماہواری چندہ لنگر کے لئے حضرت کی خدمت میں پہنچتے رہیں۔ والسلام۔

از قادیان

مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں السلام علیکم۔

۲۹ر جولائی ۱۹۰۷ء　　　خادم محمد صادق عفی عنہٗ

اس کے بعد میں بھی قادیانی کھلانے لگا۔

بنگلور میں احمدیت کی ابتداء

یوں تو بنگلور میں احمدیت حضرت سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب رضؓ کے وجود سے ہی اپنے قدم جمائی تھی۔ گویا یوں کہا جائے کہ ریاست میسور میں جماعت احمدیہ کی بنیاد حضرت سیٹھ صاحب موصوف نے رکھی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ ترقی ہونے لگی۔ میرا احمدی ہونا تھا کے

مجھ پر کفر کا فتویٰ لگ گیا۔ اپنے پرائے سب منہ پھیر لیئے دوستی کا دم جو بھرتے تھے وہ بھی دشمن ہو گئے۔ میرا مقاطعہ کر دیا گیا۔ سلام پیام۔ ملنا ملانا۔ لینا دینا سب بند۔ یہاں تک کہ میری بیوی بھی مجھ پر حرام کر دی گئی۔

بیوی کا امتحان

میرے احمدی ہونے پر ملاؤں کا دباؤ اور عزیز و اقارب کے شور و شر کا اثر میری بیوی پر بھی ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ وہ احمدی نہیں تھیں۔ لیکن بڑی سمجھدار تھیں۔ یہ میں اس لئے لکھتا ہوں کہ وہ غریب اس وقت فوت ہو چکی ہیں۔ اُن کا نام سارہ بیگم تھا۔ وہ میری رفاقت سے منہ نہ موڑیں۔ صداقت کا کبھی انکار نہیں کیا۔ بلکہ وہ سوچ میں پڑ گئیں کہ آیا اُن کا خاوند غلط راستے پر تو نہیں پڑ گیا۔ بالآخر وہ بھی احمدی ہو گئیں مخالفت کا طوفان تھا۔ مگر وہ ہر حال میں میری مونس و ہمدم بن کر برابر میری رفاقت کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے۔ اور انکی روح کو خاص اپنی جوار رحمت میں داخل فرمائے آمین

احمدیت کیلئے غیرت

زمانہ مخالفت میں جب لوگ مجھے گالیاں دیتے اور دشنام دہی کرتے تو مجھے غصہ نہیں آتا بلکہ لذت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن جب

کبھی حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السّلام کے خلاف کوئی کلمہ سُنتا تو مجھے آگ لگ جاتی اور مارے غصے کے میں لال پیلا ہو جاتا اور ایسے مخالف کو یہ جواب دیتا جو میں نے ایک شعر میں منظوم کیا ہے۔

کھدے کافر کوئی مرزا کو تو ہوتا کیا ہے
چاند کا کتوں کی عو عو سے بگڑتا کیا ہے

مولوی ثناء اللہ صاحب کے ساتھ مباہلہ

اُنھیں دنوں ہمارے اخبارات میں حضرت اقدسؑ کے مباہلہ کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ جو مولوی ثناء اللہ صاحب کے متعلق تھا۔ اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ کاذب صادق کی زندگی میں مرے مباہلہ کے معنی یہی ہیں کہ دونوں فریق متفق ہو کر ایک دوسرے کے بالمقابل بد دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو وہ سچے کی زندگی میں ہلاک ہو جائے۔ اسکی نقل جماعت احمدیہ نے بھی بنگلور میں شائع کی تھی۔ اور وہ اشتہارات میں خود سارے شہر میں تقسیم کیا تھا۔ مگر افسوس کہ مولوی ثناء اللہ صاحب نے اس دعوت مباہلہ کو قبول نہ کیا۔ اور اپنے اخبار میں لکھا کہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ سچے جھوٹے کی زندگی میں فوت ہوئے ہیں۔ آنحضرت صلعم کے وصال کے بعد جھوٹے مدعیانِ نبوت زندہ رہے۔ یہ معیار مجھے منظور نہیں۔ اور نہ کوئی دانا اسے منظور کر سکتا ہے وغیرہ۔

اس طرح وہ مباہلہ نہ ہوا۔ لیکن جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا

وصال ہوا تو مولوی ثناء اللہ صاحب نے حضرت اقدس کی تحریرات کا اُن کے منشاء کے خلاف ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ کبھی تو کہا کہ یہ ایک طرفہ دعا تھی جو نبی ہونیکی حیثیت سے لازماً قابل قبول تھی۔ دوسرے یہ کہا کہ (حضرت) مرزا صاحب اپنے اصول کے لحاظ سے کہ سچے۔ کے سامنے جھوٹا ہلاک ہو جاتا ہے نعوذ باللہ خود ہلاک ہو گئے۔ لیکن احمدیوں نے اصل حقیقت کھولی کہ مباہلہ میں دونوں فریق کا ایک دوسرے کے بالمقابل بددعا کرنا اور لعنت کرنا سُنّت نبوی سے ثابت ہے۔ نجران کے عیسائیوں کو حضور اکرم صلعم نے دعوت مباہلہ دی۔ اگر وہ مباہلہ منعقد ہو جاتا تو ضرور تھا ایک سال بھی گزرنے نہ پاتا کہ گمراہ فریق ہلاک ہو جاتا۔ اب حضرت اقدس مرزا صاحبؑ اور مولوی ثناء اللہ صاحب کے بارہ میں اول تو مباہلہ ہی نہیں ہوا۔ دوسرا فریق مقابل جس طرح کی خواہش کی اسی طرح وقوع میں آیا۔ گویا مولوی صاحب پر اتمام حجت اُنھیں کی معیار مقررہ پہ ہوئی۔ وہ اپنے اسسٹنٹ ایڈیٹر سے پوچھ لیں کہ اُنھوں نے کیا لکھا۔ اور اس کے لحاظ سے وہ کیا ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کا وصال

۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعودؑ کا وصال ہوا۔ اسکی اطلاع بذریعہ تار ہمیں اس وقت ملی

جب کہ میں اور میرے مکرم استاد حضرت موسیٰ رضا صاحب مغفور کی دکان پر بیٹھے تھے۔ اس خبر سے مجھے اسقدر رنج ہوا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا رنج نہیں ہوا تھا۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میرے اس رونے پر راستہ چلتے راہ گیر بھی رُک گئے تھے۔ مجھے رہ رہ کر افسوس اس بات کا ہوا کہ کاش میں حضور کی زندگی میں آپ سے مل لیا ہوتا۔ اس کے بعد مولٰنا حکیم نورالدین صاحب خلیفہ منتخب ہوئے اور ہم سب نے آپ کے دستِ مبارک پر تجدید بیعت کی۔ انھیں دونوں مولوی عبدالحی صاحب عرب بنگلور تشریف لائے۔ اُن کی موجودگی میں ہماری انجمن قایم ہوئی۔ اور باضابطہ تنظیم کے ساتھ کام شروع ہوا۔ ہماری اس تنظیم کے صدر میرے استاد حضرت ابوالخیر محمد عبدالحق صاحب رضؓ منتخب ہوئے۔

ایجوکیشنل کانفرنس بنگلور

سنہ ۱۹۱۲ء میں ایجوکیشنل کانفرنس بنگلور کی جانب سے ایک دعوت نامہ خواجہ کمال الدین صاحب بی۔اے۔ ایل ایل بی کو روانہ کیا گیا تھا جسکی بنا پر ایک وفد بہ سرکردگی خواجہ صاحب بنگلور آیا۔ اس وفد میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ مولوی غلام رسول صاحب راجیکی اور ایک صاحب لنشتر بھی شامل تھے۔ کانفرنس کے صدر جسٹس عبدالرحیم صاحب جج ہائیکورٹ مدراس اور سکریٹری نواب

غلام احمد صاحب کلامی تھے۔ اور اُس کانفرنس کے اجلاس تین دن ہوتے رہے۔ جن میں خواجہ صاحب کی تقاریر ہوتی رہیں۔ جو بہت ہی مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد یہ وفد دو چار دن ہمارا مہمان رہا۔ اور ہم بھی ایک تبلیغی جلسہ ٹون ہال میں منعقد کرایا۔ خواجہ کمال الدین صاحب نے جن کی تقاریر کی بنگلور میں دہوم مچی ہوئی تھی۔ دورانِ تقریر میں کہا کہ اگر میں حضرت مرزا صاحب کی خدمت میں نہ گیا ہوتا تو آج میں ایک عیسائی بنکر اس اسٹیج پر آتا۔ یہ فقرہ اُن کی تقریر کا نقطہ مرکزی تھا کہ کس طرح مسیحیت نے اسلام پر حملہ کر کے لاکھوں مسلمانوں کو عیسائی کر لیا تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے آسمان پر چڑھنے اور زندہ رہنے کے عقیدہ نے کسطرح اسلام کو نقصان پہنچایا تھا۔ غرض یہ تقریر بھی بہت مقبول ہوئی۔

علّامہ شبلی نعمانی کا خط

ابھی ہمارا یہ وفد بنگلور میں ہی مقیم تھا کہ علّامہ شبلی نعمانی صاحب کا ایک خط خواجہ کمال الدین صاحب کے نام آیا۔ اس وفد کے خطوط حاصل کرنا اور پہنچانا میرے ذمہ تھا۔ میں نے وہ خط خواجہ صاحب کو پہنچایا۔ اس خط میں شبلی نعمانی صاحب نے خواجہ صاحب کو اشاعت اسلام کے لئے لنڈن جانے پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھا کہ

ع ہائے اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی ٭ کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

مطلب یہ کہ اشاعت اسلام کا کام تو ہم جبہ پوش مولوی مشائخوں کا تھا جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گدی پر بیٹھنے کے دعویٰ دار تھے وہ تو اپنے گھروں سے خدمت اسلام کے لئے نہیں نکلے۔ اگر نکلے تو وہی لوگ نکلے جو عصر جدید کے تعلیم یافتہ انگریزی داں کوٹ پتلون میں ملبوس جنٹلمن تھے۔ جن کو یہ علماء کرام و مشائخین کافر کے خطاب سے نوازا کرتے ہیں۔

پھر یہ وفد نواب غلام احمد صاحب کلامی کی دعوت پر گولڈ فیلڈ روانہ ہوا۔ یہ عاجز اور حضرت موسیٰ رضا صاحب مغفور اور سیٹھ عبدالحمید صاحب بھی اُن کے ہمرکاب تھے۔ وہاں ہم نے سارا دن سونا نکالنے کی پوری مشنری دیکھی اور بڑی مسرت محسوس کی۔ پھر یہ وفد اپنا کام ختم کر کے مدراس روانہ ہوا اور ہم اپنے وطن واپس ہوئے۔

مولٰنا ابوالخیر محمد عبدالحق صاحبؒ کی ہجرت

کچھ عرصہ کے بعد استاذی المکرم مولٰنا محمد عبدالحق صاحبؒ نے اپنا رخت سفر باندھا۔ اور اپنے وطن مالوف ترچنا پلی تشریف لے گئے۔ جہاں موصوف کے فرزند اکبر ایک خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے بنگلور میں حضرت مولوی صاحب کا ذریعہ معاش صرف ایک مطب تھا۔ اور وہ مطب کا جو حال تھا۔ اس کا ذکر پہلے ہی

آچکا ہے ترچناپلی جانے کے تین چار سال کا عرصہ گذرا ہوگا کہ حضرت موصوف کا انتقال ہوگیا۔ وہ ہماری جماعت بنگلور کے روح رواں اور صدر ہونے کی وجہ سے نیز اُن کے احسانات کے مدِ نظر احباب جماعت اور خاص کر مجھے سخت رنج ہوا۔ استاد مرحوم کے شاعری کے تعلق سے جانشین داغ مولوی سراج الدین احمد صاحب سائل دہلوی سے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ خاکسار نے حضرت کی وفات کی اطلاع سائل صاحب کو دی۔ انھوں نے ایک قطعہ تاریخ موزوں کر کے روانہ فرمایا جو یہ ہے۔

مسیح سخن منشی بے بدل — حکیم و سخندان و پرہیزگار
ہوا راہی جادۂ آخرت — کیا اپنے احباب کو سوگوار
سنِ فوت مرحوم سائل کہو — ابوالخیر عبدالحق دیندار

۱۳۵۳

ابوالخیر حضرت مرحوم کے کنیت تھی اور مسیح سخن سائل صاحب کا عطا کردہ خطاب تھا۔ اس قطعہ سے مرحوم کے اصل کردار کا پتہ چلتا ہے کہ وہ غیروں میں کتنا عمدہ اثر نقش کر چکے تھے۔ عاجز اس قطعہ کو ایک پتھر پر کندہ کروا کر ترچناپلی روانہ کیا جو اس وقت تک اُنکی مزار پر لگا ہوا ہے۔

بعض بزرگوں کا انتقال

اُن ہی ایام کے دوران میں ہمارے بعض ممتاز رفقا و کار اور

بزرگانِ ملت کا انتقال بھی ہوا۔ جن میں ایک مولوی موسیٰ رضا صاحب رضؓ
اور ایک حکیم ضمیرالدین صاحب بھی فوت ہوئے جس کی وجہ سے
جماعت بنگلور کو دھکا لگا۔

حضرت مولانا نورالدین صاحب رضؓ خلیفہ اوّل کا سانحہ ارتحال

اور جماعت میں انتشار

۱۳ مارچ ۱۹۱۴ء کو حضرت خلیفۃ المسیح اوّل مولانا نورالدین رضؓ
کا وصال ہوا۔ جس کی وجہ سے قادیان اور دیگر مقامات میں جو احمدی جماعتیں
تھیں۔ ان میں جو انتشار و خلفشار رونما ہوا وہ جماعتوں کے لئے سخت
امتحان و آزمائش کا وقت تھا۔ جماعت دو بڑے حصوں میں منقسم
ہوگئی۔ شروع میں ایسا دکھائی دیتا تھا کہ جماعت کی اکثریت
مولوی محمد علی صاحب کے ساتھ ہے اور ان کے عقائد سے متفق ہے
پیغام صلح میں اس طرح کے اعلانات شایع ہوتے تھے کہ تقریباً
ساری جماعت ہی اُن کے ساتھ ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسوقت
جماعت کی حالت تذبذب میں تھی اور جوں جوں صحیح حالات معلوم
ہونے لگے لوگ جوق در جوق حضرت امام عالی مقام سیدنا محمود ایدہ اللہ
بنصرہ الودود کے ہاتھ پر بیعت کرکے جمع ہوگئے۔ جس طرح شمع کے
کے اطراف پروانے جمع ہوا کرتے ہیں۔ مولوی محمد علی صاحب نے اپنے
اقتدار کے لئے بہت کچھ زور مارا لیکن کامیابی کے بجائے اُنہیں

سخت خفت ناکامی و ندامت اٹھانی پڑی حضرت سیدنا محمود المصلح موعود نے کیا خوب فرمایا۔

میری غیبت میں لگا لو جو لگانا ہے زور
تیر بھی پھینکو کرو حملے بھی شمشیروں سے
پھیر لو جتنی جماعت ہے میری بیعت میں
باندھ لو ساروں کو تم مکر کی زنجیروں سے
پھر بھی مغلوب رہو گے میرے تا یوم البعث
ہے یہ تقدیر خداوند کی تقدیروں سے
ماننے والے میرے بڑھ کے رہینگے تم سے
یہ قضا وہ ہے جو بدلیگی نہ تدبیروں سے

خاکسار بڑی شرم ساری کے ساتھ اس اعتراف حقیقت پر مجبور ہے کہ بوجہ کم علمی اور خواجہ کمال الدین صاحب کے لکچروں کی مقبولیت کی وجہ سے جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ یہی سمجھتا رہا کہ خواجہ صاحب اور مولوی محمد علی صاحب ہی حق پر ہیں۔ اور عام اعتقاد کے بموجب حضرت نبی کریم صلعم کے بعد نبوت کے دروازہ کو بند خیال کرتا تھا۔ لیکن جب حضرت سیدنا محمود ایدہ اللہ الودود نے "حقیقت النبوت" کتاب تصنیف فرمائی اور اسے دیکھنے کا موقع ملا تو میرے سارے شکوک و شبہات یکسر دھل گئے اور صحیح عقاید کا علم مجھے بخوبی ہوا۔ اور میں علی وجہ البصیرت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے جملہ دعاوی پر ایمان لایا۔ ایک طرف حضرت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان خاتمیت اور دوسری طرف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اُمتی نبی ہر دو اپنے اپنے مقام پر کامل حسن و ملاحت کے ساتھ جلوہ افروز نظر آئے۔ اور یوں دکھائی دینے لگا کہ حضرت مسیح موعود کی ذات سے وصف نبوۃ کی نفی کیجائے۔ تو شانِ خاتمیت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھن لگ جاتا ہے اور بہت سے مسلمات اسلامی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ غرض یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس مسئلہ کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کروں صاحبانِ ذوق اس بارہ میں احمدیت کا لٹریچر مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

خاکسار پھر اصل مرکز پر آیا

ایک معتدبہ عرصہ تک پیغامیوں کے ساتھ رہنے کے زمانہ میں مجھ پر کئے ابتلاء آئے اور میرے دو ہونہار لڑکے یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔ اور میری حالت ایک پاگل سی ہو گئی۔ قلب کا سکون جاتا رہا۔ اور ایک وحشت سی طاری رہی۔ کاروبار خراب ہوئے زندگی بے مزہ ہو گئی۔ طرح طرح کی تکلیفیں اور آزار پہنچتے رہے۔ دراصل یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ تھی۔ قدرت مجھے جھنجھوڑ رہی تھی کہ میں راہ راست پر آجاؤں۔ آخر ایک دن شرح صدر کے ساتھ توبہ کر کے حضرت اقدس خلیفۃ المسیح ثانی ایداللہ بنصرہ کے دست مبارک پر بیعت کرلی۔ حضور نے ازراہ ذرہ نوازی میری بیعت قبول فرمائی۔ میرا بیعت نامہ اس وقت کے الفضل میں قریباً نصف صفحہ پہلے کالم پر شائع ہوا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ

میرے پاس محفوظ نہیں رہا۔

دورانِ کاروبار و تجارت میں ایک ہنگامہ

خاکسار کچھ عرصہ کے بعد کاروباری سلسلہ میں شیموگہ کے سفر پر روانہ ہوا۔ شیموگہ پہنچنے کے بعد میں اپنے ایک گاہک حافظ عبدالرحمن صاحب کے پاس گیا۔ وہ اصل میں ایک سبز رنگ کا تیل خوشبودار تیار کرتے تھے اور اپنے اطراف و جوانب کے مضافات میں لیجاکر فروخت کیا کرتے تھے۔ اور ساتھ میری اگربتیاں بھی لیجاتے تھے۔ مجھے اخبار بینی کا شوق تھا۔ جب حافظ صاحب سے بات چیت ہو رہی تھی تو اُن کی نظر اُس اخبار کے پرچہ پر پڑی جو کہ میرے کوٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا چونکہ وہ مذہبی آدمی تھے۔ اخبار دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا تم بھی قادیانی ہو۔ میرا جواب یہ تھا کہ میں بہ معنی قادیانی قادیان کا باشندہ نہیں لیکن احمدی ضرور ہوں۔ اس پر وہ آگ بگولہ ہو گئے اور جوشِ غضب میں وہ حضرت اقدس مسیح موعودؑ کی شان میں گستاخانہ الفاظ بکنے لگے اور اخبار کی مندرجہ ایک آیت کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ دیکھو یہ کیسا جھوٹ ہے کہ اس عبارت کو قرآنی کہہ کر شائع کیا گیا ہے۔ قرآن میں تو ایسی کوئی آیت نہیں۔ اور اپنے حافظ قرآن ہونے کی ڈھونس جمانے لگے مجھے بھی غصہ آگیا۔ اور میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کیا۔ اور بتلایا کہ یہ عربی عبارت ضرور آیت قرآنی ہے۔ اور تمہارا

یہ دعویٰ حافظ قرآن محض دروغ بے فروغ ہے۔ تم تو بمصداق۔

؎ لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔ اپنے نام کے ساتھ بڑائی کیلئے حافظ کا دُم چھیلا بھی لگا لیا ہے۔ میرے اُن تلخ و تند جوابات سے اُن کے منہ میں جھاگ بھر آئی۔ وہ مجھ پر دست درازی کرنا چاہتے تھے۔ بندہ کب چُپ رہتا۔ میری بھی آستینیں چڑھ گئیں۔ ایک تو جوانی کا عالم دوسرا حضرت اقدس کی عقیدت بھر گیا تھا۔ بمصداق

؎ کسی حریف سے گر تم کو کام پڑ جائے
قصور مت کرو تم بھی دہر دہو انسو ہوا

میں نے بھی ایک گھونسہ ان کے سینہ پر دہر دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں میں خوب گتھم گتھی ہونے لگی۔ بعض لوگ بیچ بچاؤ کرنے کے لئے ہمارے درمیان آگئے اور جھگڑے کو رفع دفع کیا۔ اور میں اُن سے اپنا مال واپس لیکر اپنی قیام گاہ پر آیا۔

مکرم کریم خانصاحب سے ملاقات میں اپنا مال فروخت کرنے کے بعد اپنے مستقر بنگلور روانہ ہونے کی قصد سے ریلوے اسٹیشن شیموگہ پر آیا۔ ریل کے آنے میں کچھ دیر تھی۔ پاس ہی ایک ہوٹل تھی۔ میں چاء نوشی کے لئے اُس میں داخل ہوا۔ وہاں ایک پنجابی صاحب بیٹھے ہوئے نظر آئے ہوٹل کے مالک نے جو پہلے سے مجھے احمدی جانتا تھا۔ ان پنجابی صاحب سے تعارف کرایا۔ کہ یہ صاحب بھی تمہارے پیر بھائی ہیں۔ اور ان کا نام کریم خاں ہے

یہ وہی کریم خاں ہیں۔ جو کافی عرصہ تک مکرم سیٹھ سید حسین صاحب مالک اسٹار بون مل کا ہیگڈہ کے ہاں رہے ہیں۔ ہوٹل کے مالک نے یہ بھی بتلایا کہ کریم خانصاحب ابھی ابھی پنجاب سے آئے ہیں۔ اور یہاں کوئلہ کی ٹھیکہ داری کرتے ہیں۔ میں خوشی سے کچھ دیر اُن سے باتیں کرتا رہا۔ اور چونکہ ریل مارچ ہونے کا وقت قریب تھا۔ اس لئے میں اسٹیشن پہنچکر بذریعہ ریل اپنے گھر پہنچ گیا۔ اور قریباً پانچ سال تک مجھے دوبارہ شیموگہ جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

ایک حیرت انگیز واقعہ

سنہ ۱۹۱۸ء کی بات ہے میں اخبار الفضل کا خریدار ہونے کی وجہ سے باقاعدہ اُس اخبار کا قاری تھا۔ ایک روز اخبار پڑھنے لگا۔ تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ دیکھا کہ وہی حافظ عبدالرحمٰن صاحب جن سے میری جنگ ہوئی تھی۔ وہ اب زمرۂ مبائعین میں شامل ہیں۔ اور وہ میرے پیر بھائی بن چکے ہیں۔ عجیب قدرت خدا نظر آئی وہ کس طرح قلوب کو مسخر کر لیا کرتا ہے۔ شدید دشمن بھی آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔ یوں تو شیموگہ کے بیعت کنندگان کی ایک طویل فہرست چھپی تھی۔ جن میں اکثر الحاج میر کلیم اللہ صاحب اور ان کے خاندان کے افراد کے نام تھے جن سے بعد میں میری رشتہ داری کے تعلقات بھی قایم ہوئے۔ لیکن سب سے زیادہ تعجب مجھے حافظ عبدالرحمٰن صاحب کی بیعت کا ہوا۔ شیموگہ میں احمدیت کا انتشار جناب کریم خانصاحب احمدی

کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ جزاہم اللہ خیرالجزاء۔

شیموگہ کی جماعت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بہت باخلاص جماعت ہے جن کے صدر آجکل الحاج میر کلیم اللہ صاحب اور نائب صدر ان کے فرزند اکبر عزیزی سید مدار صاحب ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی نیکیوں میں اور کاروبار میں برکت اور ان کی عمر میں اور زیادہ درازی بخشے آمین۔

اہلحدیث کانفرنس

سنہ ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے مدراس میں ایک اہلحدیث کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں۔ میں اور میرے دو اہلحدیث دوست اور ایک حنفی صاحب بھی شامل تھے۔ بہت بڑے پیمانہ پر انتظامات کئے گئے تھے۔ فرقہ اہلحدیث کے چوٹی کے علماء مثلاً مولوی ثناء اللہ صاحب۔ مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی۔ مولوی داؤد صاحب غزنوی۔ مولوی فقیر اللہ صاحب بنگلوری وغیرہم حصہ لے رہے تھے۔ بڑا بھاری پنڈال تھا پہلے دن کے اجلاس میں۔ میں اور میرے ساتھی اسٹیج کے بالکل قریب ہی بیٹھے تھے تاکہ جلسہ کی کارروائی بخوبی سُن سکیں۔ جلسہ کی کارروائی عصر کی نماز کے بعد شروع ہوئی۔ مولوی ثناء اللہ صاحب نے افتتاحی تقریر کی۔ انھوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے ایک فارسی پرمعارف قصیدہ کے اشعار پڑھ کر تقریر شروع کی۔ جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

؎ عجب نوریست در جانِ محمدؐ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک کٹر

مخالف اپنی تقریر کو حسین اور خوبصورت و دلاویز بنانے کے لئے سہارا لیتا ہے تو اُس کا جس کو وہ نعوذ باللہ کافر سمجھتا ہے۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ دیکھو یہ اشعار حضرت مرزا صاحبؑ کے ہیں۔ اور مولوی ثناء اللہ صاحب تبرکاً اپنی تقریر کی ابتداء انہی اشعار سے کئے ہیں۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ میرے دوستوں نے کہا یہ کہیں ہو سکتا ہے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب اور (حضرت) مرزا صاحب کے اشعار ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ردیف قافیہ ایک ہو۔ مگر کوئی بھی ذرا حضرت مرزا صاحب کے نظموں کا مجموعہ درثمین کھول کر دیکھے تو حقیقت صاف طور پر ظاہر ہو جائے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب کی تقریر کے بعد اور دو چار مولوی صاحبان کی تقریریں ہوئیں اور جلسہ نماز مغرب کے لئے برخاست ہوا۔ ہم جلسہ گاہ کے باہر آئے تو دیکھا کہ ایک بڑے میز پر مولوی ثناء اللہ صاحب کی تالیفات برائے فروخت رکھی ہوئی تھیں۔ میری نظر ایک چھوٹے سے پمفلٹ پر پڑی جو کہ آریوں کے رد میں لکھا گیا تھا۔ اس پمفلٹ کے ٹائیٹل پیج پر حضرت مسیح موعودؑ ایک دوسری پوری نظم " جمال و حسن قرآن نور جانِ ہر مسلمان ہے " درج تھی۔ وہ بھی میں اپنے ساتھیوں کو بتلایا۔ اور بنگلور واپس آکر دُرثمین سے ہر دو مذکورہ نظموں کی تصدیق اپنے اُن دوستوں کو کروا دی۔

اہلحدیث کانفرنس کا دوسرا اجلاس رات کے ۹ بجے سے شروع ہوا۔ اس وقت بھی میں اور میرے ساتھی اسٹیج کے قریب ہی

تھے پبلک کی تعداد بیس ۲۰ بائیس ۲۲ ہزار سے کم ہوگی۔ سب سے پہلے مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی اسٹیج پر آئے اُن کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا اور ایک اہلحدیث کا پرچہ تھا۔ اس میں سے انھوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے دعوت مباہلہ کی عبارت پڑھ کر سنائی جو مولوی ثناء اللہ صاحب کو دی گئی تھی۔ اس کے بعد نہایت تمسخر آمیز لہجہ میں اپنا ڈنڈا گھما کر کہنے لگے کہ نعوذ باللہ مرزا جھوٹا تھا وہ اپنی تحریر کے بموجب مرگیا۔ مولوی ثناء اللہ صاحب سچے تھے اس لئے وہ زندہ ہیں۔ اور اس وقت یہاں موجود ہیں وغیرہ مجھے پہلے سے ہی اُس پرچہ کی حقیقت معلوم تھی۔ مجھ سے مولوی ابراہیم صاحب کی پبلک کو دھوکہ دہی برداشت نہ ہوسکی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور مولوی صاحب سے مخاطب ہوکر کہا کہ آپ کیوں لوگوں کو مغالطہ دے رہے ہیں۔ اسی پرچہ اہلحدیث میں مولوی ثناء اللہ صاحب نے اسی عبارت کے نیچے کیا لکھا ہے وہ بھی ذرا پبلک کو پڑھ کر سنائیں۔ مولوی ثناء اللہ صاحب نے اسی پرچہ میں یہ لکھا ہے کہ "تمہاری یہ تجویز مجھے منظور نہیں۔ اور نہ کوئی دانا اسے منظور کرسکتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی معیار ہے کہ سچے کی زندگی میں جھوٹا مرجائے۔ اور ایسا ہے تو مسیلمہ کذاب جو جھوٹا تھا وہ زندہ رہا۔ اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سچے تھے وہ اُس سے پہلے فوت ہوگئے" وغیرہ اور اسی اخبار کے حاشیہ پر یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "حرام زادہ کی رسی لمبی ہوتی ہے" وغیرہ اس جلسہ کے سکریٹری

نے کہا بیٹھ جاؤ۔ بغیر ہماری اجازت کے تمہیں کچھ کہنے حق نہیں ہے" پبلک میں ایک طرف چند حنفی حضرات بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو چار میری تائید میں کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے کہ کیوں حق نہیں ہے۔ میری طرف منھ کر کے کہا کہئے صاحب جو کہنا چاہتے ہیں کہئے۔ اس پر مجھے اور زیادہ جوش آگیا اور میں نے جلسہ کے سکریٹری سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا اس کانفرنس کی یہی غرض وغایت ہے کہ اپنے مخالفوں کی عدم موجودگی میں اُن کی توہین وتحقیر کی جائے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو اُن مخالف علماء کو بھی اس کانفرنس میں بلایا جاتا اور ان سے اسی موضوع پر مناظرہ یا بحث ومباحثہ کرایا جاتا۔ اگر اب بھی اس کانفرنس کے بانیوں میں کچھ صداقت ہے تو مجھ سے وعدہ کریں اور مجھے تحریر دیں۔ میں قادیان کو تار کر کے وہاں سے کسی ایک عالم کو بلواتا ہوں۔ اسی اسٹیج پر اور اسی موضوع پر اُن سے مناظرہ کرایا جائے۔ اس کے بعد دنیا خود بخود دیکھ لیگی کہ حق کس کے ساتھ ہے نہیں معلوم اُس جوش کی حالت میں اور کیا کیا میں نے کہدیا۔ اس اسٹیج پر جو علماء تشریف فرما تھے اُن میں ایک ہل چل مچگئی اور آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اتنا تو میں نے بھی سُناکہ اس وقت اس بے ضرورت قصے کو زیر بحث لانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ مولوی صاحب کی غلطی تھی جس کی وجہ سے جلسہ گاہ میں ہنگامہ برپا ہوا۔ میرے اسطرح

دخل دینے پر جلسہ میں چیخ پکار شروع ہوگئی۔ صدر جلسہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر شور اتنا تھا۔ کہ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ اتنے میں پولیس آگئی۔ مجبوراً صدر کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ جلسہ برخاست۔ اسکے دوسرے دن جب میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں کے بازار میں جو گڈہنگ گلی کے نام سے مشہور ہے اور اس میں زیادہ تر کپڑے کی دکانیں ہیں گزر رہا تھا تو اکثر لوگ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی دکان پر لے گئے۔ اور چاء کے ساتھ تواضع کر کے کانفرنس کے واقعات پر تبصرہ کرنے لگے۔ اور میری بروقت مدافعت کا اعتراف کیا۔ اور مجھے مولوی صاحب مولوی صاحب کے الفاظ سے خطاب کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ بھائی میں مولوی مالوی کچھ نہیں البتہ ایک تاجر ہوں اور احمدی ہوں۔ جب وہ لوگ حق بات کو چھپا کر پبلک کو دھوکہ دینے لگے تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ اس لئے مجھے حق بات کو ظاہر کرنا پڑا۔ اس کے بعد جب ہم آگے بڑھے اور وہاں کی ایک بڑی مسجد کے قریب پہنچے تو مولوی فقیر اللہ صاحب جو فرقہ اہلحدیث کے ایک بڑے عالم تھے اپنے چند شاگردوں کے ساتھ اس مسجد سے باہر آرہے۔ میں آگے بڑھ کر ان کو سلام کیا اور کہا کہ مولنا آپ نے دیکھا کہ رات میں مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی نے کیا کیا اس پر وہ کہنے لگے "اجی وہ ایک گدھا ہے وہاں اُس کے ذکر کی ضرورت ہی کیا تھی" مولوی صاحب مجھے پہلے سے ہی جانتے تھے کیونکہ ایک وقت وہ تھا جب کہ میرے استاد مولوی عبدالحق صاحب

ساتھ وفات مسیح پر اُن کا تحریری مباحثہ ہوتا رہا۔ اور ایک وقت راستے میں دونوں مولوی صاحبان کی ملاقات ہوئی۔ اور علیک سلیک کے بعد مولوی فقیر اللہ صاحب میرے استاد کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔ مولوی صاحب اب اس بحث کو جانے دیں۔ آیندہ میں بھی کچھ نہیں لکھوں گا اور آپ بھی نہ لکھیں۔ اس وقت میں بھی میرے استاد کے ساتھ تھا۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی مرتبہ مولوی صاحب موصوف سے میری ملاقات بنگلور میں ہوتی رہی ہے۔ مولوی صاحب گو اہلحدیث تھے۔ لیکن مولوی ثناء اللہ صاحب اور مولوی ابراہیم سیالکوٹی کی طرز روش سے اُنھیں سخت اختلاف رہا۔ اور ان کو وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

اہلحدیث کانفرنس کے اختتام کے بعد میں جب بنگلور واپس ہو رہا تھا تو عجیب اتفاق کہ مولوی ثناء اللہ صاحب بھی اسی ٹرین سے بنگلور آرہے تھے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب بنگلور پہنچکر وہاں ایک اہلحدیث انجمن کی بلڈنگ نصرت السلام میں مقیم ہوئے۔ میں بھی اس انجمن کا ایک ممبر تھا۔ اور ہمارے سلسلہ کے دو اخبار الفضل اور فاروق اُس انجمن میں آیا کرتے تھے۔ ان اخبارات کو میں ہی جاری کروایا تھا۔ اگرچیکہ وہ بلڈنگ اہلحدیث حضرات کی تھی۔ اور سکریٹری انجمن بھی اہلحدیث تھے۔ لیکن اُس انجمن کے اراکین میں صرف اہلحدیث حضرات ہی شامل نہیں تھے بلکہ شیعہ، سنی، احمدی و دیگر فرقوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب نے جب یہ دیکھا کہ

احمدی اخبارات بھی وہاں آرہے ہیں تو آہستہ سے سکریٹری کے کان میں کہدیا کہ ان اخبارات کو یہاں نہ آنے دو۔ یہ کل کھلا کر وہ تو رخصت ہو گئے۔ مگر یہاں پھوٹ کا بیج پرورش پانے لگا۔ مولوی صاحب کو اتنا نہ سوجھا کہ باوجود اختلاف عقائد کے یہاں آپس میں اتحاد ہے۔ یہ ایک مبارک فال ہے جسکی ہر طرح تائید ہونی چاہیئے۔ بخلاف اسکے انھوں نے پھوٹ ڈالنا ہی مناسب سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا جب اور جماعتوں کے اراکین کو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب غیر فرقہ کے لوگوں سے تعاون نہیں کرنا چاہتے اور سکریٹری پابند ہے کہ انکی فرمانبرداری کرے تو سارے بگڑ بیٹھے۔ اور کہنے لگے کہ پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اس انجمن کو چندہ وغیرہ دیں۔ ہم تو یہ سمجھکر اس کے ممبر بنے تھے کہ یہ انجمن ایک مشترکہ ہے جب اُس میں مولوی ثناء اللہ صاحب یا اور کسی اہلحدیث کو مداخلت کا حق ہے تو پھر ہماری کیا ضرورت ہے۔ یہ کہکر ایک ایک کرکے سب الگ ہو گئے اور وہ انجمن بے چراغ ہو گئی اور ابتک بھی بے چراغ ہے۔

تنظیم جماعت اور بنگلور

سنہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے کہ شیموگہ کے الحاج میر کلیم اللہ صاحب اور اُن کے خسر الحاج سید حسین صاحب مرحوم اور حافظ عبدالرحمٰن صاحب جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ تینوں حضرات مولوی محفوظ الحق صاحب کو لیکر بنگلور پہنچے۔ اور بنگلور پہنچکر احمدیوں کی تلاش شروع کی۔ کسی نے

مکرم عبدالغنی صاحب مرحوم کا پتہ ان کو دیدیا۔ چنانچہ وہ لوگ ان کی
دکان پر پہنچکر سب مجھے طلب کئے اور میں انکی خدمت میں حاضر ہوا۔ پچھلی
باتیں دہرائی جانے لگیں۔ اس پرتپاک ملاقات کے بعد میں اُن حضرات
کو اپنے گھر لے آیا۔ دو چار روز وہ میرے مہمان رہے۔ اس اثنا میں اپنے
دیگر بکھرے ہوئے بھائیوں کو بھی اطلاع دی تو سب جمع ہو گئے اور اُن
سب نے بالاتفاق مجھے جماعت کا سکریٹری منتخب کیا۔ ایک مکان
میرے مکان کے قریب ہی کرایہ پر لیا گیا اور اُس میں انجمن قایم کر کے
کارروائی شروع کی گئی۔ اور باقاعدہ نماز پنجگانہ ہونے لگی۔ ہر دو زرات
میں ایک گھنٹہ درس قرآن ہوتا رہا۔ ادھر جماعت کی تنظیم ہوئی اور
اُدھر مخالفت زور پکڑنے لگی۔ اور ایک وقت اس جگہ جہاں قرآن کریم
کا درس ہوا کرتا تھا۔ اور دس بیس قرآن مجید رکھے ہوئے تھے۔
چند مسلمان کھلانے والے ایماندار وں نے پاخانہ لاکر ڈالا اُن کا
انجام بھی میں سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان میں سے کسی کو آتشک
اور کسی کو جذام اور بعض کو طرح طرح کے آلام و مصیبتوں میں مبتلا پایا۔
اَللّٰھُمَّ احفظنا من کل بلاء الدنیا والاٰخرہ سچ ہے خدائی
پکڑ سخت ہوتی ہے۔ اِنَّ بطش ربک لشدید ۝

سیّدنا خلیفۃ المسیح ثانی سے مُلاقات

سنہ ۱۹۲۱ء میں حضرت امیر المومنین سیدنا خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز

فتح کا پرچم لہراتے ہوئے لنڈن و یمبلے کانفرنس میں اسلام کی شان و شوکت کا سکہ جما کر واپس تشریف لا رہے تھے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ حضورؓ فلاں تاریخ میں بمبئی فائز ہونگے تو شمع خلافت کے پروانے جوق درجوق اپنے امام عالی مقام کے حضور نذر عقیدت پیش کرنے کے لئے بمبئی کی جانب پرواز کر گئے۔ چنانچہ بنگلور سے خاکسار اور برادرم عبدالعزیز صاحب اور ان کے ایک برادر عبدالواحد اور شموگہ سے مکرم الحاج میر کلیم اللہ صاحب اور ساگر سے قاضی عابد شریف صاحب مرحوم۔ حیدر آباد سے اکثر احباب جن میں خاص طور پر الحاج حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب۔ مولوی سید بشارت احمد صاحب اور سیٹھ محمد غوث صاحب مغفور۔ یادگیر سے الحاج حضرت سیٹھ شیخ حسن صاحب رضؓ قابل ذکر ہیں۔ باقی دوستوں کے نام یاد نہیں۔ حضور کی ملاقات کیلئے بمبئی تشریف لائے تھے۔ حیدر آباد دیگر علاقوں کے احمدی دوستوں سے وہیں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔

مبلغین سلسلہ کی آمد

حضرت سیدنا خلیفۃ المسیح ثانی کی ملاقات کے بعد جب ہم اپنے وطن واپس ہوئے تو معمولی طور پر ہماری تبلیغی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس اثنا میں قادیان سے جنوبی ہند کے دورے کے لئے حضرت حافظ روشن علی صاحب رضؓ اور مولوی عبدالکریم صاحب حیدر آباد ہوتے ہوئے بنگلور تشریف لائے اور ایک دو بڑی کامیاب تقریریں پبلک کے روبرو بنگلور میں ہوئیں۔

اس کے بعد حضرت حافظ صاحب اپنے ساتھیوں سمیت شیموگہ روانہ ہوئے وہاں ٹون ہال میں ایک کثیر مجمع میں آپ کی ایک زبردست بصیرت افروز تقریر ہوئی۔ اس کے بعد جب مولوی عبدالکریم صاحب کی تقریر ہونے لگی تو دوران تقریر میں غنڈوں نے حسد کی آگ میں جلکر ہال پر پتھر پھینکے۔ اور ایک سب انسپکٹر پولیس عبدالغنی نامی نے غنڈوں کو اکسا کر موٹر کار کی سیٹ پر جہاں حافظ صاحب بیٹھکر ٹون ہال آئے تھے۔ پاخانہ ڈلوا دیا۔ واپسی پر جب حافظ صاحب اُس سیٹ پر بیٹھے تو کچھ گیلا محسوس ہوا۔ آپ ہاتھ چھو کر دیکھے تو وہ پاخانہ تھا۔ اس پر حافظ صاحبؓ نے ہنسکر کہا کہ ان بیچاروں کو میرے لئے پاخانہ اٹھا کر لانے میں کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس سے حافظ صاحبؓ کی قوت برداشت اور مکارم اخلاق کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے مقتدار دمہدی کے رنگ میں کتنے رنگین تھے۔ جنھوں نے فرمایا۔

؎ گالیاں سُنکر دعا دو پاکے دُکھ آرام دو
وہ اگر پھیلائیں بدبُو تم بنو مشکِ تتار

ہمارے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی اس سے بڑھ کر ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک یہودی آپؐ کے فراہم کردہ بستر پر پاخانہ کر کے چلدیا تھا۔ اور آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اُسے صاف کر رہے تھے۔ خیر یہ رویہ قدیم سے مخالفین میں چلا آیا ہے۔ کوئی بات نہیں نئی نہیں ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جس

شخص نے حضرت حافظ صاحب رضؓ کی سیٹ پر پاخانہ ڈلوایا تھا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ چند دنوں کے بعد وہ ایک وقت رفع حاجت کے لئے پاخانہ میں گیا تھا وہاں اُس کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ اور وہ اُس پاخانہ میں ہی ڈھیر ہوگیا۔

حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضؓ کی آمد

پھر کچھ عرصہ کے بعد حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضؓ بنگلور تشریف لائے۔ انکی آمد پر ہم اُن کو ریلوے اسٹیشن سے اپنے گھر تک بڑے شاندار جلوس میں لائے دوسرے دن وائی۔ ایم سی۔ میں آپکا مشاہدات امریکہ" پر انگریزی میں لکچر ہوا۔ اس وقت کا بھی عجیب آسمان تھا۔ وہ نورانی شکل سفید لمبی سی ڈاڑھی اس پر سبز جبہ اور عمامہ پھر انگریزی میں تقریر۔ گویا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ آسمان سے کوئی فرشتہ اتر آیا ہے۔ میرے بازو چند تعلیم یافتہ ہندو بیٹھے تھے وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ دیکھو کیسی پیاری صاف انگریزی ہے۔ مسلمانوں میں بھی کیسے لائق لوگ ہیں وغیرہ اُس لکچر کے بعد اور چند طالب علم وو کلا صاحبان نے مفتی صاحب رضؓ سے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ کل شام میں سائنس اور اسلام پر ہائی اسکول میں آپ کا ایک لکچر ہو۔ حضرت مفتی صاحب رضؓ نے تقریر کرنی منظور کرلی۔ لیکن اس سے

پہلے کبھی اس موضوع پر آپ کو لکچر دینے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔
اس لئے دوسرے دن صبح کی نماز کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ یہاں
قریب میں کوئی پارک ہے تو وہاں مجھے لے چلو۔ میر صاحب کی کار
موجود تھی۔ میں اسی وقت اُنھیں لیکر لال باغ نامی ایک پارک میں
پہنچا۔ وہاں آپ قریباً ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر اپنے اس لکچر کی تیاری کی۔
اور شام میں ایک ہندو ہنمنت راؤ صاحب جج ہائی کورٹ کی
صدارت میں آپ کا لکچر ہوا۔ حاضرین میں سب تعلیم یافتہ بڑے
بڑے گراجویٹ وغیرہ تھے۔ اور سب کے سب بڑی توجہ سے
سنتے رہے۔ اور جب لکچر ختم ہوا تو صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ
حضرت مفتی صاحب نے جس دلکش پیرایہ میں اسلام کی تعلیم پیش
کی ہے۔ اُس کا مجھ پر خاص اثر ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے اس وقت
میں مسلمان ہوں۔ کیوں کہ میں اُن تمام معقول باتوں کو مانتا ہوں۔
جن کو مقرر نے بیان کیا ہے۔ اس واقعہ سے دو باتیں روز روشن
کی طرح واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لکچرار خواہ کتنا ہی قابل
کیوں نہو اُسے قبل از وقت اپنے لکچر کے متعلق نوٹس و اشارات
لکھنے پڑتے ہیں۔ جو ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ حسن کلام ایسا
ہو کہ سامعین کے دلوں کو موہ لے۔ حضرت مفتی صاحب رضؓ میں یہہ
دونوں امور بدرجہ اتم موجود تھے ایک تو وہ قرآن کریم کے علم کلام
سے بخوبی واقف تھے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ حضرت مفتی صاحب

کی صحبت میں رہے ہوں وہ خوب جانتے ہیں۔ کہ انھیں اپنے
مافی الضمیر کے ادا کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور ایسے ظریف الطبع
اور شیریں مقال تھے کہ سامعین آپ کی باتوں کو گراں محسوس کئے
بغیر گھنٹوں سنتے رہتے۔ جلسہ سالانہ کے موقع پر جہاں حضرت مولوی
سرور شاہ صاحبؓ کی ٹھوس علمی تقریر ہوتی تو خشکی کی وجہ سے لوگ
جم کر زیادہ نہ بیٹھ سکتے وہاں حضرت مفتی صاحبؓ کی تقریر کیوقت
لوگ بڑے شوق سے گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ حضرت مفتی صاحبؓ
کی عادت تھی کہ کسی مسئلہ کو سمجھانے کے لئے دورانِ تقریر میں موقع
بہ موقع مناسب لطایف بھی سنایا کرتے تھے۔ سامعین بعض دفع
ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ یہ اُن میں خداداد بات تھی جو
بہت کم دوسروں کے حصہ میں آتی ہے۔

اسلام اور سائنس کے عنوان پر ایک کامیاب و موثر
تقریر کرنے کے بعد حضرت مفتی صاحبؓ نے سیرت النبی صلی اللہ
علیہ وسلم کے عنوان پر چھاونی کے ایک محمد علی ہال میں اردو میں
تقریر فرمائی۔ سارا ہال سامعین سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ یہاں تک
کہ نیچے راستہ پر بھی صدہا لوگ کھڑے ہو کر تقریر سُن رہے تھے۔
اور آپ کے حسنِ بیان کا یہ اثر تھا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ تقریر
کے ختم ہونے پر میں نے دیکھا کہ معززین و عمائدین شہر نے آپ
سے مصافحہ کیا اور یہ کہتے سنا گیا کہ ہم نے ابتک بڑے بڑے مولویوں کے

مواعظ و تقریریں سُنی ہیں لیکن ایسا واعظ ابتک سننے میں نہیں آیا۔ اُن تقاریر کی مقبولیت نے حضرت مفتی صاحب رضؓ کی شہرت میں چار چاند لگا دے بشہر کے سنجیدہ لوگوں کی اکثریت کی یہ خواہش رہی کہ حضرت مفتی صاحب رضؓ دوسرے دن مسجد اعظم میں وعظ فرما دیں جو وہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ لیکن اس مسجد کے متعصب متولی نے تقریر کی اجازت نہیں دی۔ حضرت مفتی صاحب رضؓ بنگلور کی مصروفیات سے فارغ ہو کر مدراس تشریف لے گئے۔

مولٰنا عبدالرحیم صاحب نیر رضؓ کا نزول

مفتی محمد صادق صاحب رضؓ تشریف لے جانے کے تھوڑے عرصہ بعد مولوی عبدالرحیم صاحب نیر رضؓ بنگلور تشریف لائے۔ صاحب موصوف کے تشریف لانے سے چند دن پہلے میری بیوی نے ایک خواب دیکھا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن میرے خیال میں بزرگانِ دین کی آمد بمنزلہ تشریف آوری حضور صلعم ہے۔ کیونکہ حضور کی خدمت واسلام کی تبلیغ کے لئے یہ بزرگ آتے رہے ہیں۔ مولٰنا نیر صاحب رضؓ کا قیام بھی غریب خانہ پر ہی تھا۔ بنگلور چھاؤنی اور سٹی میں میجک لانٹین کے ذریعہ مولٰنا کے

متعدد لیکچر ہوئے اور انہیں لیکچروں کے سلسلہ میں میسور مہاراجہ کالج کے طلباء نے بھی مولنا نیر صاحب رضی کو اپنے کالج میں تقریر کرنے کی دعوت دی جس کو قبول کر لیا گیا۔ چنانچہ میں اور مکرم سیٹھ کلیم اللہ صاحب مولنا موصوف کو لیکر بذریعہ کار میسور روانہ ہوئے مولنا نے مہاراجہ کالج میں جو لیکچر دیا وہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اسکے دوسرے دن مہاراجہ سے قریباً آدھ گھنٹہ حضرت نیر صاحب رضی کی ملاقات رہی۔ مہاراجہ نے مولنا کی کارکردگی کے صلہ میں مبلغ دو صد روپیہ کا عطیہ ایک چیک کی صورت میں مرحمت فرمایا۔ غرض یہ سفر بھی بہت کامیاب رہا۔ مولنا نیر صاحب رضی نے حیدرآباد کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ اور بنگلور بھی کئی دفعہ آتے جاتے رہے۔ انہیں دنوں میں احراری فتنہ پورے جوبن پر تھا۔ ایسے زمانہ میں بید دار جی سکر بنگلور کے غیر احمدی مولویوں نے فضا کو سازگار دیکھکر ہمارے ساتھ مناظرہ کرنیکی تقریب پیدا کی۔ جسکو ہم نے بھی منظور کر لیا یہ مناظرہ بنگلور سٹی عثمانیہ ہال میں ہوا۔ مولوی عبدالرحمن صاحب خادم ہماری جانب سے مناظر تھے اور فریق ثانی کی طرف سے کئی ایک مولوی صاحبان مناظر تھے طے یہ پایا تھا کہ پہلے دن اجرائے نبوت فی خیر امت کے عنوان پر گفتگو ہو۔ دوسرے دن وفات مسیح علیہ السلام کا مسئلہ زیر بحث آئے۔ اور تیسرے دن صداقت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق مباحثہ ہو جائے بڑے بڑے پوسٹر اور اشتہارات دیواروں پر لگائے گئے اور بہت سے

دستی اشتہارات بھی تقسیم کئے گئے ہال میں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ رکھا گیا تھا۔ ساتھ ہی پولیس کا بھی معقول انتظام تھا۔ جلسہ کے صدر بنگلور کے ایک رئیس مولوی عبدالغفور صاحب مقرر کئے گئے۔ حیدرآباد سے مولانا نیر صاحبؓ۔ مولوی عبدالرحمن صاحب خادم۔ مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی۔ مکرم سیٹھ محمد اعظم صاحب مولوی لقمان صاحب وغیرہم تشریف لائے تھے۔ پہلے دن کے مناظرہ میں مولوی عبدالرحمن صاحب خادم نے تقریر فرمائی۔ اس تقریر کو ہمارے نوجوان مناظر نے قرآن۔ حدیث واقوال بزرگان سلف سے استدلال کرتے ہوئے اکیس ۲۱ دلائل سے مزین کیا تھا۔ تقریر کی روانی وشعلہ بیانی سے سامعین محظوظ ومسحور ہوئے۔ اسکے بعد جوابی تقریر کے لئے فریق ثانی کے ایک مولوی صاحب اٹھے۔ جن کی مدد کے لئے اور کئی مولوی صاحبان ان کی پشت پر موجود تھے۔ اس تقریر میں زیادہ تر قصے کہانیاں اور موضوع احادیث کا تذکرہ رہا۔ مگر جناب خادم صاحب کے دلائل کا مطلق جواب نہ تھا۔ صدر جلسہ نے یہ محسوس کرکے کہ احمدیت کا پلہ بھاری ہے۔ اپنے تعصب اور چالاکی سے یہ عذر گھڑ لیا اور کہدیا کہ اسوقت فساد کا اندیشہ ہے۔ اس لئے میں دوسری تقریر کی اجازت نہیں دیتا۔ اور جلسہ برخاست کردیا۔ اورانھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنا کیا کرایا غارت کردیا۔

میت کے ساتھ سلوک

اختتام مناظرہ کے دوسرے دن ہی ہمارے ایک احمدی بھائی کا خورد سالہ بچہ جو گذشتہ کئی ماہ سے بیمار تھا۔ فوت ہوگیا۔ جب ہم اسکی تدفین کے لئے قبرستان پہنچے تو ایک مخالف مولوی نورالدین نامی اپنے چند شاگردوں کو لیکر وہاں آپہنچا۔ یہ وہی مولوی تھا۔ جو بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ ماہ رمضان میں جبکہ مرزا صاحب ایک دفعہ دہلی میں تقریر کرتے کرتے چا نوش فرمائی تھی تو اُن پر پہلا پتھر مارنے والا میں ہی تھا۔ کل کے مناظرہ میں وہ خود بھی موجود تھا۔ اور اپنے لوگوں کی ناکامی کو بچشم خود دیکھ چکا تھا۔ حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ یہ مولوی کہنے لگا کہ یہ قبرستان ہمارا ہے۔ کسی قادیانی کی کیا مجال ہے۔ جو اس میں اپنا مردہ دفن کرسکے یہ کہکر اُس معصوم بچے کی کھدی ہوئی قبر کو اپنے فیل پا پاؤں سے روند کر بند کردیا۔ یہ موقع سخت فتنہ و فساد کا تھا۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی تعلیم کے پیش نظر اُس ظلم کو ہم سہہ گئے اور کچھ احتجاج نہ کیا۔ بلکہ آئینی کارروائی کی جانب توجہ کی۔ اور پولیس میں رجوع ہوئے۔ پولیس کو ہم سے ہمدردی ضرور تھی۔ انھوں نے کہا کہ وہ قبرستان سرکاری نہیں ہے بلکہ کسی صاحب کا ذاتی ہے۔ اس میں ہم مداخلت نہیں کرسکتے۔ بات معقول تھی۔ ہم نے سمجھا کہ قبرستان کے متولی صاحب سے

رجوع ہوں۔ چنانچہ ہم سیٹھ عبد الستار بن حاجی اسماعیل سیٹھ صاحب متولی قبرستان کے پاس گئے وہ بہت ہی مصروف انسان تھے ہمیں اندیشہ تھا کہ وہ ہمیں ملیں گے بھی یا نہیں غنیمت کہ وہ ہمیں اپنے مکان پر مِل گئے۔ ہم نے اپنا سارا دُکھ اُن کے گوش گذار کیا۔ اور درخواست کی کہ وہ خود چل کر اپنی موجودگی میں اس میت کی تدفین کا انتظام کرائیں اِس پر اُنھوں نے فرمایا کہ اچھا تم چلو۔ میں آتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ وہ کون بد معاش ہے جو روکتا ہے۔ ہمیں اُن کے شریفانہ سلوک سے بڑا اطمینان ہوا۔ اور خدا کی قدرت نظر آئی وہ اپنے بندوں کی مشکلات کے وقت کیسی مدد کرتا ہے ہم قبرستان پہنچے ہی تھے کہ سیٹھ عبدالستار صاحب متولی اپنی کار میں وہاں پہنچ گئے اس عرصہ میں دو ڈھائی سو غنڈے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ متولی صاحب نے اُس دیو ہیکل مولوی کو مخاطب کر کے کہا اس میت کے دفن کرنے میں رکاوٹ ڈالنے والے تم کون ہو؟ مولوی نے کہا کہ ہم اس لئے دفن کرنے نہیں دیتے کہ یہ ایک قادیانی کا بچہ ہے اس کا جواب موصوف نے یہ دیا کہ بیشک میں جانتا ہوں کہ یہ میت قادیانی بچے کی ہے۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اس سے پہلے اس قبرستان میں کتنے قادیانی دفن ہو چکے ہیں۔ اور تم جانتے نہیں کہ یہ قبرستان کس کا ہے

اور کون اس کا ذمہ دار ہے۔ بہتر ہے کہ تم سب اسوقت یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں ابھی پولیس کے ذریعہ تمہیں نکلوا دونگا اور تمہاری خیر نہ ہوگی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ایک با اثر لکھ پتی آدمی ہے۔ اور اس کا پولیس میں اثر و رسوخ ہے۔ وہ سب کے سب دُم دبا کر خاموش نکل گئے اور ساری اکڑ فوں بھول گئے۔ مکرم سیٹھ صاحب بہ نفس نفیس اپنی موجودگی میں دوڑھکی ہوئی قبر کھدوائی اور میت کی پوری تدفین تک ٹھیرے رہے اور ہمیں دشمنوں کے چنگل سے بچایا ہمارے جذبات تشکر ایک تو خدا تعالیٰ کے حضور انتہائی بلندی پر پہنچ رہے تھے۔ اور دوسری طرف ہم متولی صاحب موصوف کے بھی صمیم قلب سے مشکور تھے جو آڑے وقت ہمارے کام آئے۔ قبرستان میں ہی موقتی رسم شکرگذاری ادا کرنے کے دوسرے دن ہم نے محسوس کیا کہ ہمارا ایک وفد سیٹھ صاحب موصوف کے بنگلہ پر جاکر مزید اُن کا شکریہ ادا کرے۔ چنانچہ خاکسار اور مولوی لقمان صاحب و مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی اور سیٹھ عبدالحمید صاحب موصوف کی کوٹھی پر پہنچکر اپنے تشکر و امتنان کا مزید اظہار کیا۔

مخالفت کا زور ان واقعات کے بعد پھر مخالفت بہت زور و شور سے ہونے لگی۔ اکے دکے احمدیوں کو پکڑ کر پیٹا جانے لگا۔ اخبارات میں ہمارے خلاف

پُرزور مضامین شایع ہونے لگے۔ اور یہ پروپاگنڈہ کیا جانے لگا کہ عرب و عجم و ساری دنیائے اسلام کے علماء کا فتویٰ ہے کہ قادیانی سخت کافر ہیں۔ اُن کے ساتھ سلام کلام بند۔ کھانا، پینا لینا دینا بند۔ خوشی، غمی میں شریک ہونا بند۔ اُنکے لئے تختہ پلنگ بند۔ یہاں تک کہ اُن کے مُردوں کو اپنے قبرستان میں دفن کرنا بھی بند۔ غرض کہ بالکل بائیکاٹ کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ باوجود احمدی نہ ہونے کے ہم سے ہمدردی رکھتے تھے اور ہماری خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے وہ بھی ہم سے کنارہ کش ہو گئے۔ اور ہمارے بعض کمزور احمدی بھی اس بائیکاٹ کی تاب نہ لا کر مرتد ہو گئے۔ بلکہ غیروں کے ہاں میں ہاں ملا کر احمدیت کے خلاف اشتہارات بھی شایع کرنے لگے۔ اور اس عاجز کو شیطان سے بدتر سمجھنے لگے اور صاف منہ پر کہنے لگے کہ اس کو پہلے ختم کرو وغیرہ۔ غرض وہ وقت ایسا تھا کہ سر چھپانے بھی جگہ نہیں تھی۔ اور سوائے خدا کے کوئی ہمارا پرسان حال چارہ ساز و چارہ گر نہ تھا۔ ہمارے لئے زمین باوجود فراخی کے تنگ ہو گئی تھی۔

ایک معزز وفد کی آمد مذکورہ ناسازگار و پریشان کن حالات میں رحمتِ خداوندی کا نزول اس طرح ہوا کہ لاہور سے ایک وفد بہ سرکردگی مولوی غلام محمد صاحب اختر ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ ربوہ بنگلور وارد ہوا اس وفد

ہیں علاوہ صدر کے مولوی عبدالرحمٰن صاحب جٹ اور مولوی عبدالرحیم صاحب
بی۔اے بھی شامل تھے۔ مولوی غلام محمد صاحب اختر نے
مجھسے فرمایا کہ مجھے سر مرزا اسماعیل صاحب دیوان ریاست میسور
سے ملنا ہے۔ میری ملاقات کا انتظام کرایا جائے۔ میں ان کے
حسب منشاء اتوار کے روز پانچ بجے شام کے قریب انہیں
لیکر دیوان صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ اختر صاحب نے اپنا
(visiting) ملاقات کا کارڈ اُن کے آدمی کے ذریعہ
بھجوا دیا۔ اور ہم کمرہ ملاقات میں انتظار کرنے لگے۔ کمرہ ملاقات
کوٹھی سے قریباً ڈیڑھ سو قدم کے فاصلہ پر تھا۔ اس کارڈ کے پہنچنے
پر دیوان صاحب بہ نفس نفیس پیش قدمی کرتے ہوئے ہماری
طرف آئے۔ اور ہمیں لے کر اپنی کوٹھی کے سامنے کے بہت ہی
خوشنما باغ میں پہنچے۔ اور ہم تینوں قریباً آدھ گھنٹہ تک اُس
باغ میں ٹہلتے رہے۔ پہلے تو دیوان صاحب اختر صاحب سے
مخاطب ہو کر مرحوم چودھری ظفر اللہ خانصاحب کے حالات اور
اُنکی مصروفیات وغیرہ کا حال دریافت کرتے رہے۔ اس کے بعد
وہ مجھ سے مخاطب ہو کر دریافت کرنے لگے کہ تمہاری جماعت
کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا وہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اخبارات
وغیرہ میں آجکل ہمارے خلاف کیا کچھ طوفان بدتمیزی برپا ہے۔
ہمارا حقہ پانی بند کر دیا گیا ہے۔ یعنی ہم سے مقاطعہ کلی کیا گیا ہے

سلام کلام بند۔ لین دین بند۔ خوشی غمی میں شرکت بند۔ یہاں تک کہ ہمارے لئے تجہیز و تدفین کے لئے ڈولا اور نہلانے کیلئے تختہ دیا جانا بھی بند کر دیا گیا ہے۔ وہ فرمانے لگے۔ ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اب آپ لوگ چاہتے کیا ہیں۔ میں نے موقع مناسب جان کر عرض کیا کہ یہاں جو قبرستان ہے وہ سرکاری ہے۔ اس میں جو حق دوسرے مسلمانوں کا ہے وہ ہمارا بھی ہے ہمارے باپ دادا اس میں دفن ہیں۔ جب وہ لوگ ہم کو اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے ہیں تو ہم کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ اس قبرستان میں سے تھوڑی زمین ہمارے لئے بھی مختص کر دی جائے۔ پھر کوئی جھگڑا ہی نہیں رہیگا۔ میری اس درخواست سے دیوان صاحب نے اتفاق کیا۔ اور فرمایا کہ مجھے بھی یہ تجویز پسند ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کا تعلق کمشنر سے ہے۔ آپ ان کے پاس درخواست دیں۔ میں بھی ان سے کہدونگا۔ میں یہ بھی بتادوں کہ میری دیوان صاحب سے پہلے بھی ملاقات ہوئی تھی جبکہ چودھری سر ظفر اللہ خانصاحب تشریف لائے تھے پھر جب مولٰنا نیر صاحبؓ تشریف لائے تو ان کے ذریعہ بھی دو چار دفعہ دیوان صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

دیوان صاحب کو احمدیت کی تبلیغ

دیوان صاحب اپنے اس باغ سے پھر اپنی کوٹھی پر ہمیں لے گئے۔ موقع پاکر اختر صاحب دیوان صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ دیکھئے آپ کو خدا تعالیٰ اس دنیا میں بہت بڑا مقام عطا فرمایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حیات اخروی میں بھی اس سے بہتر مقام عطا فرما دے۔ اس لئے آپ تحریک احمدیت پر غور فرما دیں۔ انہوں نے فرمایا اچھا میں غور کروں گا۔ امریکہ سے سن رائز رسالہ میرے پاس آتا ہے اور اُسمیں ہمارے صندل سوپ کا اشتہار بھی شایع ہو رہا ہے لیکن مجھے حضرت مرزا صاحب کی نبوت کے متعلق کچھ اطمینان نہیں ہے۔ اتنے میں گھڑی چھ بجادی اور وہ اٹھکر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ اب مجھے مہاراجہ کے پاس جانا ہے۔ اور ہم بھی اجازت لیکر وہاں سے روانہ ہوے۔ ابھی ہم کوٹھی کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ اور اختر صاحب مجھ سے چند قدم آگے تھے۔ اس اثنا میں مہاراجہ کی کار آگئی۔ میں تو پہلے ہی سے مہاراجہ کو دیکھا ہوا تھا۔ جھٹ کنارے ہو گیا۔ اختر صاحب کو مہاراجہ کا علم نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ کوئی آفیسر دیوان صاحب سے ملنے آیا ہوگا بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ وہ مہاراجہ صاحب کی کار تھی دیوان صاحب اُس میں آکر بیٹھ گئے۔ اور ہم ابھی چل ہی رہے تھے کہ مہاراجہ کا

باڈی گارڈ جو چاندی کا ڈنڈا ہاتھ میں پکڑے ہوئے کار کے آگے حصہ میں بیٹھا تھا۔ دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آیا۔ اور کہنے لگا کہ حضور آپ کو بلا رہے ہیں۔ نہیں معلوم دیوان صاحب نے ہمارے متعلق مہاراجہ سے کیا کچھ کہا ہو۔ ہم بھی تیزی سے کار کی جانب بڑھے۔ اختر صاحب آگے اور میں پیچھے تھا۔ اختر صاحب نے مہاراجہ کو سلام کیا اور مزاج پرسی کی مہاراجہ نے جواب دیا "اب اللہ کا فضل ہے" اور دریافت کیا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ اختر صاحب نے کہا کہ میں لاہور سے آیا ہوں۔ مہاراجہ نے پوچھا کہ کیا آپ میسور بھی جائیں گے جواب دیا گیا کہ ارادہ تو ہے تو فرمایا ضرور جائیے۔ یہ کہنے کے بعد مہاراجہ کی کار آگے بڑھ گئی اور ہم خوشی خوشی گھر آئے۔

ایک بے لگام مخالف کا انجام

جب ہم دیوان صاحب سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ تو مکرم مولوی عبدالرحمن صاحب جٹ بہ ہمراہی سیٹھ عبدالحمید صاحب رضی حکیم نورالدین کے ہاں گئے تاکہ انہیں تبلیغ کریں۔ کیونکہ مولوی صاحب چپ بیٹھنے والے انسان نہیں تھے۔ کوئی نہ کوئی تبلیغ کا ڈھنگ نکالنے کے لئے بے تاب رہتے تھے یہی ذہنیت تھی جو انہیں حکیم نورالدین کے پاس لے گئی۔ اس خبیث حکیم نے یہ سمجھا کہ کوئی شکار آیا ہے۔ جس سے مجھے فائدہ ہوگا۔ وہ اپنے فہ ہنا

میں یہ تصور کر کے کہ یہ کوئی مریض ہے بڑی تواضع سے پیش آیا۔ اور دریافت کرنے لگا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ اور یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں قادیان سے آیا ہوں اور میری غرض آپ کے پاس آنے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس زمانہ میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو انتظام فرمایا ہے۔ اُس کا حال آپ کو سُناؤں یہ سُنتے ہی اسکے جسم میں آگ لگ گئی۔ اور وہ مولوی صاحب کو جی بھر کر گالیاں دینے لگا۔ مولوی صاحب بیچارے خاموش سُنتے رہے۔ جب وہ خوب گالیاں دے کر تھک گیا تو آخر اُس نے اپنے اخلاق حسنہ کی اس طرح تان توڑی اور کہا کہ "پلید و یہاں سے نکل جاؤ" اس پر وہ دونوں حضرات بہت ہی غمگین و افسردہ اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئے۔ انکا رنج و غم اس لئے تھا کہ مسلمانوں کے اخلاق عادات اِسقدر کیوں گر گئے ہیں کہ جو بد سے بدتر ایک خطرناک دشمن سے بھی روا نہیں رکھا جاتا۔ وہ سلوک ہم سے کیا جا رہا ہے۔ غرض سوائے صبر کے ہمارے پاس تھا ہی کیا۔ لیکن خدا تعالیٰ کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ ایک بے کس و مجبور خدا کے پیارے پر پتھر برسانے اور ایک معصوم بچے کی لاش کی بے حرمتی کرنے اور اس کی قبر کو اپنے ناپاک پیروں سے روندنے اور

ایک بے گناہ کو بلا وجہ مغلظ گالیاں دے کر دل دکھانے کے واقعات نے عرش الٰہی کو ہلا دیا۔ یہ بدزبان مخالف علاوہ مولوی اور حکیم ہونے کے ایک بہت بڑا پیر بھی سمجھا جاتا تھا۔ ایسا ہی ایک اور پیر تاج پیران نامی ریاست میسور میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ جب وہ تاج پیران رٹیائر ہونے لگا تو یہ مولوی نورالدین اس کے پاس گیا۔ اور اپنی غربت وافلاس ونکبت کے واقعات بیان کر کے تھوڑی سی بنجر زمین بنگلور سے قریباً چالیس میل فاصلہ پر اپنے نام پٹہ کرالیا تھا۔ اس زمین کو دیکھنے کے لئے وہ گیا تھا کہ وہاں اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

چونکہ وہ زمین آبادی سے دور تھی بہ مشکل اس واقعہ کی اطلاع دوسرے دن اس کے گھر والوں کو ملی۔ اس کے گھر میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا کہ فوراً مقام واردات پر پہنچتا۔ بہر حال تیسرے دن ایک غیبان نامی موٹر سروس والا اس لاش کو اپنی موٹر میں ڈال کر لایا۔ نورالدین چونکہ جسیم آدمی تھا۔ اس کو مرے ہوئے بھی تین دن ہو گئے تھے۔ اس کی لاش سڑ چکی تھی اور اس قدر عفونت ہو گئی تھی کہ کسی آدمی کو جنازہ کو کندھا دیتے ہوئے سخت نفرت لاحق ہوتی تھی۔ یہ عبرت ناک انجام بھی بہت سبق آموز رہا۔ سچ ہے ہمارے ایک احمدی دوست رُہتاسی صاحب مغفور نے کیا خوب فرمایا ؎

ایک ہستی ایسی ہستی ہے اُس ہستی کا انبار نہیں ⁘ اور اُسکے علم سے پوشیدہ کونین میں کوئی راز نہیں
اے لاٹھی والے مت اترا ہاں ڈر جا اُسکی لاٹھی سے ⁘ وہ لاٹھی ایسی لاٹھی ہے اُس لاٹھی میں آواز نہیں

قبرستان کی زمین

آمدم بر سرِ مطلب۔ دیوان صاحب کی ہدایت کے بموجب جماعت احمدیہ کے لئے قبرستان کی زمین دئے جانے کے متعلق میں نے اپنی ایک درخواست کمشنر صاحب کے ہاں روانہ کردی۔ اس اثناء میں دیوان صاحب کی سفارش بھی کمشنر صاحب کے پاس ہمارے متعلق پہنچ چکی تھی۔ کمشنر صاحب نے مجھے بلوایا۔ اور واقعات و حالات دریافت کئے۔ میں نے اپنے مخالفین کے رویہ کا کچا چھٹا اُنکے آگے کھولکر رکھدیا۔ اس پر کمشنر صاحب متاثر ہوئے اور فرمایا کہ سرکاری قبرستان میں سے زمین کا ایک حصہ تمہارے لئے مخصوص کردیا جائیگا۔ یہ تجویزیں ہمارے درمیان ہو رہی تھیں کہ اسکی اطلاع کسی طرح ہمارے مخالفین کو ہو گئی۔ اور اُن کے دو چار لیڈر کمشنر صاحب کے پاس پہنچ گئے اور کہنے لگے کہ معلوم ہوا ہے کہ آپ قادیانیوں کیلئے قبرستان میں سے کوئی زمین کا ٹکڑا خاص طور پر دینا چاہتے ہیں۔ آپ ایسا نکریں۔ کیونکہ مسلمانوں میں بہت سے فرقے ہیں اگر آج آپ قادیانیوں کو قبرستان کا ایک حصہ دیدیں تو کل کے روز اہلحدیث شیعہ وغیرہ بھی اپنے لئے ایک الگ زمین مانگیں گے۔ ایسی

صورت میں پھر سارا قبرستان تقسیم ہو جائیگا۔ اس پر کمشنر صاحب نے ان سے پوچھا کہ پھر کیوں تم لوگ قادیانیوں کو کافر کہتے ہیں۔ اور اُنکے مردوں کو اس قبرستان میں دفن کرنے نہیں دیتے۔ وہ کہنے لگے ہم تو ان کو کافر نہیں کہتے۔ بالفرض اگر ایسا کہیں بھی تو ہوتا کیا ہے۔ یوں تو مسلمانوں میں۔ شیعہ، سنی۔ وہابی۔ چکڑالوی وغیرہ بہت فرقے ہیں جو ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں۔ باوجود اس کے اُن سب فرقوں کے مردے اس قبرستان میں دفن ہوتے ہیں۔ یہ سُنکر کمشنر صاحب نے کہا کہ اچھا میں اس کے متعلق اور تحقیقات کرونگا اس کے بعد کمشنر صاحب نے شہر کے سر قاضی کو طلب کیا۔ یہ قاضی میرا ہم سبق اور نہایت دوست تھا۔ میں نے سلسلہ کی بہت سی کتابیں اسکو پڑھنے کے لئے دی تھیں۔ ان کتب کے مطالعہ کے بعد وہ (۹۰) فیصد احمدی ہو چکا تھا۔ لیکن اپنی قضاوت کے چلے جانے کے خوف سے وہ احمدیت کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ کمشنر صاحب نے جب اس سے پوچھا کہ کیا قادیانی کافر ہیں یا مسلمان۔ تو قاضی نے بہت جوش سے جواب دیا کہ کون کہتا ہے انکو کافر۔ وہ تو پکے مسلمان ہیں۔ اسلام کی تبلیغ بہت زور شور سے کرتے ہیں۔ اس کام کے علاوہ ہندوستان اور یورپ وغیرہ میں بھی اُنکے

مشن قائم ہیں. وغیرہ. یہ سننے کے بعد کمشنر صاحب نے مجھے بلوایا. اور سارا گزرا ہوا واقعہ سنا کر کہنے لگے کہ اب میں تمھیں کوئی الگ زمیں دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

مزید جدوجہد کمشنر صاحب کے تصفیہ سے میں متفق نہیں تھا. اس لئے عالمِ مایوسی میں قبرستان کے متولی عباس خانصاحب کے پاس گیا. وہ باوجود غیر احمدی ہونیکے ہم سے ہمدردی رکھتے تھے. اور انکی حضرت مولٰنا نیر صاحبؓ سے ملاقات بھی تھی. میں نے اُن سے کہا کہ آپ اس قبرستان کے متولی ہیں. اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت ہمارے خلاف کسقدر طوفان بدتمیزی برپا ہے. اگر خدا نخواستہ کوئی موت فوت ہم لوگوں میں ہو جائے تو کیا آپ اسوقت ہماری مدد کرینگے. وہ کہنے لگے ہاں میں جانتا ہوں. اسوقت آپ لوگوں کے خلاف ملک میں سخت مخالفت پھیلی ہوئی ہے. مگر اس سے آپ لوگ گھبرائیے نہیں. اگر کوئی ایسی ضرورت پیش آئے تو آپ میرے پاس آجائیں. میں سب کچھ ٹھیک کر دونگا. جس پر مجھے کچھ اطمینان سا ہو گیا.

ایک احمدی لڑکے کا انتقال چند دنوں کے بعد ہمارے ایک احمدی بھائی عبدالرزاق کا لڑکا بیمار ہوا. اسے کچھ پیٹ کی شکایت تھی اور

اُسے وکٹوریہ ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ وہاں وہ قریبًا ایک ماہ زیر علاج رہا۔ طبیعت تقریبًا اچھی ہو گئی تھی۔ وہاں سے ڈسچارج ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ یہ لڑکا بیزار ہو کر بغیر اجازت دوا خانہ سے بھاگ آیا۔ دوا خانہ میں اُسے سخت پرہیز میں رکھا گیا تھا۔ جس سے وہ تنگ آگیا تھا۔ اور گھر آکر اچھی اچھی مرغن غذائیں کھانے لگا۔ جسکی وجہ سے اس کی طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ پھر جینے کی امید نہیں رہی۔ اس کے باپ نے مجھ سے کہا کہ میں اس بیمار لڑکے کو پھر سے ہسپتال داخل کر دیتا ہوں۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ وہ اس لڑکے کو لیکر سیٹی کے حدود میں پہنچا تھا کہ وہ گاڑی میں ہی فوت ہو گیا۔ اس کا باپ اُس کی لاش وہیں پر اپنے ایک بھتیجے کے گھر میں رکھ کر میرے پاس آیا اور کہا کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔ آپ اپنی جماعت کے لوگوں کو اطلاع دیکر دس بجے تک میرے بھتیجے کے گھر آجاؤ۔ میں سب دوستوں کو اطلاع دے کر خود دس بجے سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ دوسرے احباب بھی آگئے۔ اور میت کو غسل وغیرہ دیکر ساڑھے دس بجے جنازہ لیکر ہم قبرستان پہنچ گئے۔ قبر پہلے سے کھدی ہوئی موجود تھی۔ ہم لوگ جنازہ بڑھ کر اس قبر کے پاس آئے تو وہاں کا مکاندار ایک چھٹی ہمکو دکھلایا اور کہنے لگا کہ دیکھو یہ چھٹی چھپا ڈونی سے چودھری محمد ابراہیم کے پاس سے آئی ہے اس میں لکھا ہے کہ

یہاں سے ایک قادیانی کی میت وہاں آرہی ہے۔ آئے تو اسکو میرے آنے تک دفن کرنے مت دو۔ چودھری ابراہیم بھی بڑا سخت مکذب تھا۔ اور حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی شان میں ہمیشہ گندہ دہانی کرتا رہتا تھا۔ اور اسکا انجام بھی بہت ہی برا ہوا۔ دو تین سال فالج میں مبتلا ہو کر وہ بستر مرگ پر پڑا رہا۔ اور بہت ہی بری حالت میں مر گیا اور بمصداق خس کم جہاں پاک۔ اس دنیا سے چل بسا۔

غرض جب یہ رکاوٹ پیدا ہو گئی تو میں اپنے ایک بھائی مکرم حاجی بی۔ ایم عبدالرحیم صاحب کو لیکر بذریعہ ٹیکسی عباس خانصاحب کے پاس پہنچا۔ جنھوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وقت آنے پر میں تمہاری مدد کرونگا۔ وہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ وہاں ایک مسلم ہال ہے۔ اس دن اس ہال میں غربا کو کھانا کھلانے کا انتظام تھا۔ وہ اس میں مصروف تھے۔ اور ہم کو ان تک پہنچنا بھی مشکل تھا۔ پھر بھی کوشش کر کے میں ان کے پاس گیا۔ اور کہا کہ دیکھئے جس بات کا ہمیں پہلے سے اندیشہ تھا وہ آج ہوتا نظر آرہا ہے۔ ایک انتقال کا واقعہ ہوا ہے۔ اب آپ چلئے اور اس میت کو دفن کرنے کا انتظام کیجئے۔ وہ کہنے لگے آپ جائیں میں ابھی اس امرکاندار کے پاس چیٹھی روانہ کرتا ہوں اور اس میت کو دفنانے کا انتظام کرتا ہوں۔ میں نے کہا امید نہیں وہ مان جائیگا

بہتر ہے کہ آپ خود چلیں ورنہ اسی ہیرا پھیری میں اور
لوگ وہاں جمع ہو جائیں گے اور شرارت کرنے لگ جائیں گے
اس پر وہ چلنے کے لئے آمادہ ہوئے اور اپنے گھر آئے
اس عرصہ میں چند غنڈے اُن کے گھر پر جمع ہو گئے
اور کہنے لگے، کہ ہم ہرگز اس قادیانی مردے کو
وہاں دفن کرنے نہیں دیں گے۔ اگر آپ ان کی تائید
کریں گے تو ہم آپ سے بھی بگڑ جائیں گے۔ اس پر
عباس خاں صاحب نے بہت کچھ ان کو سمجھایا۔ لیکن وہ
ماں نے میں نہیں آئے۔ اس پر عباس خاں صاحب نے
مجھے الگ لے جا کر کہا کہ یہ لوگ اب شرارت پر تلے
ہوئے ہیں۔ بہتر ہے تم لوگ پولیس کے ذریعہ جو کرنا
ہے کر لیں۔ اس پر ہم نے سمجھا کسی پر بھروسہ کرنا
کس قدر غلطی ہے۔ عباس خاں متولی قبرستان با اثر
آدمی تھا۔ اس نے اپنے آپ کا غلط اندازہ کیا تھا۔ جس
کی وجہ سے ہم کو اطمینان دلایا تھا کہ وقت پر
میں تمہاری مدد کروں گا۔ لیکن وقت پر کچھ نہ
کر سکا۔ بالآخر ہم پولیس میں رجوع ہونا پڑا
جب ہم پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچے وہاں
کوئی افسر موجود نہیں تھا پھر ہم دوسرے

پولیس اسٹیشن پر گئے۔ وہاں بھی کوئی موجود نہیں۔ اسی طرح ہم کوئی چار۔ چھ اسٹیشن گئے۔ لیکن ہمیں کوئی ذمہ دار آفیسر نہیں ملا۔ کیوں کہ وہ اتوار کا دن تھا۔ آخر بہ مشکل ایک اسٹیشن پر ایک ہیڈ کانسٹیبل ملا۔ اور وہ ہندو تھا۔ وہ کہنے لگا۔ اچھا ٹھیرو میں ابھی سپرنٹنڈنٹ کو فون کرتا ہوں۔ دیکھیں وہاں سے کیا جواب آتا ہے یہ کہہ کر اس نے بذریعہ فون اس واقعہ کی اطلاع سپرنٹنڈنٹ کو کر دی۔ وہاں سے جواب آیا۔ کہ تم اپنے عملہ کو لے کر مقام وقوع پر پہنچ جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں یہ سُن کر ہم قریباً شام کے پانچ بجے قبرستان پر پہنچے۔ اس وقت تک وہاں کوئی چار پانچ سو آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اور ہمارے دس پندرہ آدمی جو موجود تھے ان میں سے کئی ایک کھسک گئے اور صرف لڑکے کا باپ اور مکرم عبدالغنی صاحب مرحوم اور دو چار آدمی موجود تھے۔ ہم قبرستان پہنچے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پولیس سپرنٹنڈنٹ بھی وہاں پہنچ گئے اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ کیا فساد کرنے کی غرض سے تم لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں۔ وہ کہنے لگے۔ کہ نہیں ہرگز نہیں۔ پھر کیوں اس میت کو دفن کرنے نہیں دیتے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پولیس کا

ایک بڑا عملہ اور کمشنر اور دیگر حکام وغیرہ بھی آپہنچے۔
شام ہوگئی تھی۔کمشنر نے ان لوگوں کو مخاطب کرکے پوچھا۔
کہ تم لوگوں کو کیا حق ہے کہ اس میت کو دفن ہونے سے
روکتے ہو۔ یہ قبرستان سرکاری ہے۔کسی کی ذاتی ملک
نہیں ہے۔اور کیوں تم لوگ یہاں جمع ہیں۔کیا تم فساد کرنا
چاہتے ہیں۔ اس پر ان کے ایک دو لیڈر آگے آکر کہنے
لگے۔کہ ہم فساد کرنا نہیں چاہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ میّت
چھاؤنی سے آئی ہے۔ چھاؤنی میں قبرستان رہتے ہوئے
وہاں دفن نہ کرکے میّت کو یہاں فساد کرنے کی غرض سے لائے
ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ قانونی طور پر بھی ہم کو
مجرم بنایا جائے۔کیوں کہ کسی میّت کو ایک مقام سے کسی
دوسرے مقام پر لے جانا ہو تو پولیس کو اطلاع دے کر اس کی
اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے پاس ایسی کوئی اجازت
نہ تھی۔ اس لئے وہ حکام کشمکش و پنج میں پڑگئے۔ اور مجھ
سے کہنے لگے کہ یہ بات صحیح ہے؟ میں نے کہا آپ خود
سمجھ سکتے ہیں اگر ان کی یہ بات صحیح ہے اور ہم خود یہاں
فساد کرنے کی غرض سے آئے ہیں تو ذرا اس ہجوم کو دیکھیئے
اور غور فرمایئے کہ ان کے بالمقابل ہم کتنے ہیں۔ کیا یہ چار
پانچ آدمی ان ہزاروں کے ساتھ فساد کر سکتے ہیں؟

بات اصل میں یہ ہے کہ بیشک یہ مرنے والا لڑکا چھاؤنی کا تھا۔ اور وہ بیمار ہو کر قریبًا ایک ماہ یہاں کے وکٹوریہ ہسپتال میں رہا۔ اور اچھا ہو گیا۔ اس کے کچھ دن بعد پھر وہ سخت بیمار ہو گیا اور یہ اس کا باپ ہے (باپ کی طرف اشارہ کرکے)۔

دوبارہ اُسے اُسی دواخانہ میں داخل کرنے کی غرض سے یہاں لایا گیا اور وہ دواخانہ کے قریب پہنچا تھا کہ راستہ میں ہی اس کا انتقال ہو گیا یہاں بھی اُن کے رشتہ دار موجود تھے۔ ان کے باپ نے چاہا کہ لاش کو چھاؤنی واپس لے جانا غیر ضروری ہے۔ یہیں دفن کر دیں گے۔ اس بیان کو سُن کر کمشنر نے کہا اب اس میت کو چھاؤنی لے جانے میں کیا ہرج ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ہم لے جاویں تو یہ لوگ وہاں بھی پہنچیں گے۔ اور کہیں گے کہ بستی میں قبرستان ہوتے ہوئے یہ لوگ اس میت کو یہاں فساد کرنے کی غرض سے لائے ہیں۔ اس لئے ہم اس میت کو یہاں دفن کرنے نہیں دیں گے۔ ایسی صورت میں پھر ہم کیا کریں۔ اسی اندیشہ کے مدنظر ہم نے پہلے ہی آپ سے ایک الگ زمین کا مطالبہ کیا تھا۔ اگر ہمارا ارادہ ان سے فساد کرنے کا ہی ہوتا تو پھر وہ مطالبہ کرتے ہی کیوں کہ ہمیں زمین کا ایک الگ ٹکڑا دیدیا جائے۔ غرض اس قصہ کو جانے دیجئے۔ ہم بھی آپ کی رعایا ہیں اور یہ قبرستان کسی کی ذاتی ملکیت

نہیں سرکاری ہے۔ اگر یہ لوگ ہم کو اپنے ساتھ رکھنا نہیں
چاہتے تو ہم کو بھی ان کے ساتھ رہنے کی کوئی خواہش نہیں۔ اس
قبرستان میں سے یا الگ کوئی اور زمین ہمیں دیدیں پھر کوئی جھگڑا ہی
نہیں رہے گا ورنہ اس مرنے والے کے ساتھ ہم بھی مر مٹ
جائیں گے۔ لیکن یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔ جب میری یہ دردبھری
آواز بچشم نم ان حکام کے کانوں تک پہنچی تو وہ سمجھ گئے کہ واقعی
یہ لوگ مظلوم ہیں۔ اس کے بعد وہ عہدہ دار آپس میں تقریباً
آدھ گھنٹے تک مشورہ کرتے رہے۔ اور اس وقت گیارہ بج چکے
تھے۔ وہ مجھ سے یوں گویا ہوئے کہ اب رات زیادہ ہوگئی ہے
اس لیئے ہم اس وقت کچھ نہیں کرسکتے۔ تم لوگ اس میت کو
اس قبر پر سے اُٹھاکر پاس کے میدان میں رکھدو۔ ہم اس
کی حفاظت کے لیئے ۲۵ ریزرو پولیس رکھ دیں گے۔ تم اپنے
گھروں کو واپس جاؤ۔ کل صبح میں آؤ ہم تمھیں ایک زمین منتخب
کرکے دیدیں گے۔ ہم نے حکم کی تعمیل کی۔ اور میت کو وہاں سے
اُٹھاکر اُن کے بتلائے ہوئے میدان میں رکھ دیئے۔ ہمارے
دل حکام کی اس ہمدردی سے مشکور تھے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ
کی تائید تھی کہ اُن حکام کے دل ہماری طرف مائل ہو گئے
قریباً ایک بجے رات کے ہم اپنے گھروں کو لوٹے میت پولیس
کی نگرانی میں رہی۔ اِدھر میرے گھر کا حال یہ تھا کہ بیوی

سخت بیمار حیثیت میں مبتلا دواخانہ میں زیر علاج تھی۔ گھر میں سب گم عمر بچے تھے۔ میں صبح ۹ بجے سے نکلا ہوا رات کے ایک بجے واپس گھر آیا تو معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں بچوں کو کوئی یہ کہتا کہ تمہارا باپ زخمی ہوا دواخانہ میں ہے۔ کوئی کہتا تمہارا باپ جیل میں بھیج دیا گیا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس قسم کے واہی تباہی باتیں سن کر میرے معصوم بچوں کے دل دہل گئے اور وہ بے اختیار رو رو کر آنکھیں متورم کر لئے انھیں اصل حقیقت بتلا کر تسلی دینے والا کوئی نہ تھا۔ جب میں گھر پہنچا تو انھیں بے انتہا تسلی اور خوشی ہوئی۔ میں ان بچوں کو اصل واقعہ بتلا کر گھر میں کھانے پینے کے لئے جو کچھ میسر تھا انھیں کھلا پلایا۔ جب وہ سو گئے تو میں وضو کر کے نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔

دعائے مستجاب بدرگاہ قاضی الحاجات

میں نے اپنے رب اعلیٰ کے حضور گڑگڑا کر انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ یوں گریہ وزاری کی کہ میرے رب رحیم وکریم مشکل کشا، حاجت برار مولا بے شک ہم بدکار و گنہگار ہیں لیکن باوجود اپنی انتہائی کمزوریوں کے پھر بھی تیرے حبیب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے جن کو تو نے اس زمانہ کا مصلح و ریفارمر بنایا ہے۔ ہم ادنیٰ

خادم ہیں۔ اس وقت جو معاملہ حکومت کے آگے پیش ہے۔ وہ
کچھ اپنے گھر کا نہیں۔ بلکہ تیرے قائم کردہ سلسلہ کا ہے۔ ایک طرف
ہم بہت تھوڑے نحیف وکمزور ہیں۔ اور ہمارے بالمقابل دشمن کا
ایک بڑا لشکر جرار ہے۔ ہم مفلس و نادار ہیں۔ اور ہمارا عدو
طاقتور اور مالدار ہے۔ اگر اس وقت اس کے بالمقابل ہماری
شکست ہو جائے۔ تو پھر اس بنگلور میں احمدیت کا نام لیوا
کوئی نہ ہوگا اس لئے اے پاک پروردگار تو ہماری مدد کو آ،
اور ہمیں ان دشمنوں پر جو ناحق ہمیں دکھ دیتے اور ستاتے ہیں
فتح و نصرت عطا فرما۔ اور حکام کے دلوں کو ہماری طرف پھیر دے
آمین اللہم آمین یہ دعا کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لیے مصلی پر ہی میں سو
گیا۔ نماز فجر کے بعد میں اپنے ایک بزرگ سیٹھ علی محمد صاحب مرحوم
برادر خورد حضرت سیٹھ عبدالرحمن صاحب رض کے پاس گیا۔ اور
ان کو سارا واقعہ سنایا۔ انھوں نے سن کر فرمایا۔ چلو اس وقت
میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ اگرچہ کہ یہ بزرگ بہت ہی
ضعیف العمر ہونے کی وجہ سے چلنے پھرنے میں تکلیف محسوس
کرتے تھے۔ لیکن حرارت ایمانی کی وجہ سے وہ بھی میرے ساتھ
ہو گئے۔ دس بجے دن کے قریب ہم اس قبرستان پر پہنچے۔
اس وقت تک پولیس کا کوئی عہدہ دار نہیں آیا تھا صرف
چند پولیس کانسٹیبل متعین تھے اور لوگ جوق در جوق ٹکریاں

بن بن کر آرہے تھے۔ اور گیارہ بجے تک کوئی دو ڈھائی ہزار کا ہجوم وہاں ہو گیا۔ اور ہم چار، چھ نفوس کس مپرسی کی حالت میں ایک جھاڑ کے تلے بیٹھے تھے۔ اور یہ دعا پڑھ رہے تھے۔ اللّٰھم انا نجعلک فی نحورھم و نعوذ بک من شرورھم کہ یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ مہاراجہ میسور اپنی کار میں اُدھر سے گذر رہے ہیں۔ وہ میسور سے بنگلور آرہے تھے۔ اور اُن کے آنے جانے کا راستہ یہی تھا جو میسور روڈ بھی کہلاتا ہے۔ یہ قبرستان بھی اسی روڈ پر لب سڑک ہے۔ مہاراجہ نے جھک کر اس غیر معمولی ہجوم کو دیکھا۔ اور اپنے مقام پر پہنچکر نہیں معلوم ان ذمہ دار حکام سے کیا کہا اور کیا نہیں۔ آن واحد میں وہ سارے حکام دوڑتے ہوئے آئے۔ اور مجھے الگ لے جا کر کہنے لگے۔ دیکھو اگر ہم تمکو اسی قبرستان میں کوئی الگ جگہ دیں گے تو کل کا دن یہ لوگ پھر کوئی نہ کوئی شرارت کریں گے اور ہمیشہ تم لوگوں کو پریشان کرتے رہیں گے۔ اس لئے ہم ایک اس سے اچھی زمین تمہارے لئے انتخاب کر آئے ہیں۔ تم یہ بات اپنے مخالفوں سے مت کہو۔ ہماری ایک لاری آتی ہے۔ اس میں اس جنازہ کو رکھ دو۔ اور تم سب بھی اس میں بیٹھ جاؤ۔ پولیس رہے گی۔ ہم خود بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ اس اثناء میں لاری آگئی

اور پچاس ریزرو پولیس کے جوان بھی آگئے۔ ہم اُس جنازہ کو اُٹھا کر لاری میں رکھ دیئے اور ہم بھی اس میں بیٹھ گئے۔ آگے پیچھے ریزرو پولیس اور دس بارہ ٹورنگ کار جس میں دو پولیس آفیسر بیٹھے ہوئے تھے۔ بیچوں بیچ ہماری لاری دوڑ رہی تھی تو یوں دکھائی دیتا تھا کہ جارج پنجم یا کسی بڑے لارڈ کا جلوس جا رہا ہے۔ یہ نظارہ ہمارے مخالفوں کو خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اور ہماری زبانوں پر اللہ تعالیٰ کے افضال کو یاد کر کے بے اختیار الحمد للہ کا ورد جاری تھا۔ یہ جلوس بڑے بازار سے گذرا تو لوگوں نے بڑی دلچسپی سے دیکھا غیر متعلقہ لوگوں کے لئے بھی یہ واقعہ بڑا عجیب تھا۔ اور قدرت خداوندی کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ غرض ہم اُس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں کی زمین ہمارے لئے منتخب کی گئی تھی اُس زمین کو دیکھ کر ہماری ساری کلفت دور ہوگئی۔ یہ ایک سابق دیوان کشن مورتی کا آم کا باغ تھا۔ جو لب سڑک واقع تھا۔ پہلے جو قبر کھودی گئی تھی وہ ایک پتھریلی زمین تھی یہاں کی زمین لال مٹی کی تھی جو نہایت نرم اور ملائم تھی۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہوئے اس باغ میں پہنچے جہاں پہلے ہی سے پولیس آفیسر قبر کے کھودے جانے کا انتظام کر چکے تھے۔ قبر کھودی جا رہی تھی۔ عہدہ داران پولیس

تدفین کے ختم تک ہمارے ساتھ رہے۔ آخر میں قبر پر پولیس کا پہرہ بٹھا یا گیا تا کہ ہمارے دشمن پھر کوئی خرابی نہ مچا دیں پولیس کے عہدہ دار ہمیں تسلی دیتے ہوئے رخصت ہوئے۔ ہم نے بھی اُن کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا۔

مخالفین کا مکر ردھاوا ابھی ہم روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اور پولیس کے عہدہ دار بھی پوری طرح نہیں گئے تھے۔ کہ مخالفین نے یہاں بھی دھاوا بول دیا۔ اُن کے آدمی یہ معلوم کرنے کے لئے آئے تھے، کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے۔ اور موقع پا کر یہاں بھی شرارت کا طوفان کھڑا کر دیں۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس سے کہا کہ دیکھیئے یہاں بھی یہ لوگ پہنچ گئے ہیں۔ اتنا کہنا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ کو غصہ آگیا۔ کیونکہ اُن لوگوں کی سابقہ کارگذاری سے وہ کافی دِق ہو گئے تھے۔ پولیس کو حکم دیدیا کہ ان پر لاٹھی چارج کر دو۔ پھر کیا تھا جب لاٹھیاں برسنے لگیں تو وہ اس قدر بدحواس بھاگے کہ اپنی سیکلیں بھی چھوڑ گئے۔

گمراہ کن پروپگنڈہ ہمارے ایک دوست مکرم حاجی میر کلیم اللہ صاحب کی جو کہ اس وقت

جماعت شموگہ کے صدر ہیں۔ انکی لڑکی کی شادی تھی۔ اس میں میں بھی مدعو تھا۔ جب میں شموگہ جانے کی تیاری کر رہا تھا تو یک بہ یک مخالفین نے یہ افواہ بڑے زور سے پھیلائی کہ قادیانی سکریٹری یعنی خاکسار کی بیوی فوت ہو گئی ہے۔ آن واحد میں یہ خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ اور صدہا لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ اور کچھ لوگ قبرستان پر بھی گئے۔ اور ایک بڑا ہجوم میرے گھر کے اطراف بھی جمع ہو گیا۔ اور پڑوس کی بڑی بوڑھی عورتیں جو میری بیوی سے میل ملاپ اور محبت رکھتی تھیں۔ چیختی چلاتی میرے گھر آنے لگیں۔ اور یہ تو میں پہلے ہی بتلا چکا ہوں کہ میری بیوی پیچش میں مبتلا ہو کر قریبًا ایک ماہ دواخانہ میں رہیں اور جس وقت قبرستان کے سلسلہ میں ایک ہنگامہ بپا تھا وہ سخت بیمار تھیں۔ باوجود علاج معالجہ اور اچھے اچھے انجکشن لگاتے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بالآخر تنگ آکر میں نے بیوی کو گھر لا لیا۔ ہم اُن کی زیست سے مایوس تھے۔ ایک دن خود میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ دواخانہ میں پرہیز کرتے کرتے تنگ آگئی ہوں۔ اب مجھے تھوڑا ہی زندہ رہنا ہے۔ آخر موت ہی مقدر ہے تو میرا دل جو چاہتا ہے وہ مجھے کھلا دو۔ اُن کی خواہش کے مطابق ایک وقت

اُن کو بریانی کھلائی گئی۔ خُدا کی قدرت دیکھئے کہ اُس بریانی کا یہ اثر ہوا کہ اجابت میں خون جو آیا کرتا تھا وہ بند ہو گیا۔ اس افواہ کے پھیلانے کی بظاہر یہ بھی ایک وجہ تھی اس افواہ کے پھیلائے جانے کے دن سے ہی وہ اچھی خاصی تندرست ہو گئیں۔ دیڑھ دو ماہ سے جو بالکل فرلش تھیں وہ چلنے پھرنے اور کام کاج کرنے لگ گئیں۔ الحمدُ لِلّٰہ۔

سکندرآباد میں آمد

مندرجہ بالا واقعات ۱۹۰۶ء سے لیکر ۱۹۳۷ء تک کے ہیں۔ کچھ میرے کاروباری حالات ایسے ہو گئے جسکی وجہ میں اپنی ایک عرصہ دراز کی خدمت سلسلہ کی ذمہ داری جو میرے کمزور کندھوں پر رکھی گئی تھی میرے ایک عزیز بشیر احمد صاحب کو سونپ کر ۱۹۳۷ء میں سکندرآباد چلا آیا۔ اور قریباً ۲۳ سال سے میرے محترم بزرگ الحاج حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب قبلہ اور مقامی احمدی دوستوں کے قرب میں رہتا ہوں۔ نہ تو اب مجھ میں بوجہ پیرانہ سالی وہ تاب و توانائی رہی اور نہ وہ پہلے جیسی چل پہل۔ اب میری زندگی بمصداق ؎

ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را

رہ گئی ہے۔ اور اب یہ آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا خاتمہ اسی احمدیت پر کرے۔ جو حقیقی اسلام ہے۔ جس کے روح پرور

نظارے خداوند کریم نے اس زندگی میں مجھے کئی بار دکھائے ہیں۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی ذرہ نوازی ہے جو اس نے مجھ جیسے کمترین کو اور میری بیوی کو ابتلاؤں میں ثابت قدم رکھا۔ اور بزرگانِ سلسلہ کی خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

ایک تنکے سے بھی بدتر تھی حقیقت میری
لیکن خدا تعالیٰ کے فضل نے ذرہ کو آفتاب بنا دیا۔

اس موقعہ پر جبکہ میں اپنے مضمون کے آخر پر پہنچ رہا ہوں کچھ اپنی ذات کے متعلق بھی لکھدوں۔ کیونکہ میری ذات احمدیت سے جدا نہیں جہاں تک قبول احمدیت پر استقامت کا سوال تھا۔ اسکی اوپر صراحت ہو چکی ہے۔ غالباً ۱۸۸۴ء میں میں پیدا ہوا۔ اور ۲۹ جولائی ۱۹۰۷ء میں بیعت سے مشرف ہو کر سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوا۔ اور اس وقت یعنی ۳۰ نومبر ۱۹۶۰ء کو بفضلہٖ تعالیٰ میں (۷۶) سال کی عمر کو پہنچا ہوں۔ میری پہلی شادی غالباً ۱۹۰۴ء میں مسماۃ سارہ بیگم مرحومہ سے ہوئی۔ وہ میری مونس و ہمدم قریباً ۴۴ سال تک میری رفاقت میں رہی اور بتاریخ ۲۱ مئی ۱۹۴۹ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ مرحومہ سے ۱۲ بچے پیدا ہوئے۔ جن میں اس وقت چھ بقید حیات ہیں۔ ان میں دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ لڑکوں کے

نام بشیر احمد اور نذیر احمد ہے۔ اُن سب کی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ کثیر الاولاد اپنے اپنے کنبہ میں خوش خرم ہیں اور میں نے بضرورت شرعی دوسری شادی اپنی ایک ہموطن سیدہ صفیہ بیگم صاحبہ سے ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو کی۔ بوقت نکاح وہ احمدی نہ تھیں لیکن بعد میں صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کر کے حلقہ بگوش احمدیت ہوئیں موصوفہ کے بطن سے اس وقت چار بچے ہیں۔ جن میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ لڑکوں میں محمود احمد اور ایک مقصود احمد ہے۔ لڑکیوں میں ایک اختر سلطانہ دوسری فرخ دُر دانہ ہے اللہ تعالیٰ ان سب کی عمر و اقبال میں ترقی دے اور ان کو نیک صالح متقی اور خادم اسلام بنا دے۔ آمین

اور میں بہ زمانہ قیام بنگلور دس روپیہ کے اندر اندر اپنا چندہ ماہواری ادا کرتا تھا۔ اور اُس وقت میری حیثیت اتنی ہی تھی۔ لیکن سکندر آباد آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ اب میں پچاس روپیہ تک ماہانہ اپنا چندہ حصہ آمد وغیرہ دے رہا ہوں۔ اور بفضلہ تعالیٰ یکم جنوری ۱۹۳۲ء سے موصی ہوں اور ۱۹۴۰ء میں جبکہ میں اپنی جائیداد بطور ترکہ اپنے ورثاء میں تقسیم کر دیا۔ اُس وقت اپنی وصیت کی رقم بھی (۱/۱۰) کے حساب سے چار سو انتیس روپیہ بذریعہ عزیزی سیٹھ یوسف احمد الہ دین صاحب مکرم سکرٹری صاحب وصیت ربوہ کے نام بھیج چکا ہوں۔ اور جب سے حضور

ایداللہ بنصرہ العزیز نے تحریک جدید کی تحریک فرمائی ہے اس وقت سے ہی میں اُس مبارک تحریک میں بھی شریک ہوں۔ اور میری بیوی مرحومہ سارہ بیگم صاحبہ بھی موصیہ تھیں اور اُن کی وصیت ایک بٹا چار کی تھی۔ مرحومہ کی وفات پر اُنکے ترکہ سے اُن کی وصیت کی رقم (١/٤) کے حساب سے سات سو اسی روپیہ ٢٢ر اگست ١٩٤٩ء کو مرکز قادیان روانہ کردیگئی۔ علاوہ اس کے اور چار صد روپیہ مرحومہ کے ترکہ سے مولنا عرفانی صاحب رض کو انکے کتب کی اشاعت کیلئے دیے گئے۔

اس مختصر حال گوش گزار کرنے کے بعد میں اپنے دوستوں عزیزوں سے ایک دردمندانہ اپیل کرتا ہوں۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ جو چیز اپنے لئے پسند کیجائے وہ دوسروں کے لئے بھی پسند کریں۔ اور یوں بھی قرآن کریم کا ایک اہم ارشاد ہے۔ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ۔ جو حق و صداقت میں نے پائی ہے وہ دوسروں کے آگے پیش کردوں۔ دنیا چندروزہ ہے۔ ہماری ابدی زندگی اس جسمانی زندگی کے بعد ہے۔ جسے آخرت کہتے ہیں۔ مومن کا کام یہ ہے کہ وہ دین و دنیا میں دونوں جگہ سرخرو و کامیاب اور کامران رہے۔ اگر کسی وجہ سے دنوی زندگی خراب بھی ہو تو چنداں ہرج نہیں مصیبت کے دن کسی طرح کٹ ہی جائیں گے۔ لیکن بڑا گھاٹا اور

نقصان تو وہ ہے کہ جہاں ہماری دائمی و دوامی زندگی ہے وہ تباہ و برباد ہو جائے۔ خُدا نہ کرے کہ یہ خُسران و حرمان کسی کو نصیب ہو۔ اِس لئے میرے محترم بھائیو!

اِس زمانہ کی گمراہی و بے دینی فسق و فجور کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا۔ اور اپنا ایک مُصلح عین ضرورت کے وقت مبعوث فرمایا۔ وہ مسیح موعود ہے۔ وہ ہماری رُوح کی تسکین۔ ہمارے امراض کا علاج اور ہماری تریاقِ فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ بس اُس مُصلح ربانی کی طرف رجُوع ہو کر اپنی عاقبت درست کرلو۔ اُس نے اپنی سُریلی آواز میں یہ قرنا سُنائی ہے۔ ؎

صدق سے میری طرف آؤ اسی میں خیر ہے
ہیں درندے ہر طرف میں عافیت کا ہوں حصار

میں وہ پانی ہوں کہ آیا آسماں سے وقت پر
میں ہوں وہ نورِ خدا جس سے ہوا دن آشکار

پھر فرمایا اے وہ تمام لوگو جو زمین پر بستے ہو اور اے وہ تمام انسانی روحو جو مشرق و مغرب میں آباد ہو۔ میں پورے زور کے ساتھ آپ کو یہ دعوت دیتا ہوں کہ اب زمین پر سچا مذہب صرف اسلام ہے۔ اور سچا خدا وہی خدا ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ اور ہمیشہ کی روحانی زندگی پانے والا نبی اور جلال اور تقدس کے تخت پر بیٹھنے والا نبی صرف حضرت محمد مُصطفےٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ہے۔ جس کی

روحانی زندگی اور پاک جلال کا ہمیں ثبوت ملا ہے کہ انکی پیروی اور محبت سے ہم روح القدس اور خدا کے مکالمہ اور آسمانی نشانوں کے انعام پاتے ہیں۔ (تریاق القلوب)

بس مبارک ہیں وہ جو اس آسمانی آواز پر لبیک کہے اور فلاح دارین حاصل کرے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۞

طالبِ دُعا

احقر غلام قادر شرق بنگلوری

از سکندرآباد دکن۔ ۳۰ نومبر ۱۹۶۰ء

از کلام حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام

ہر طرف فکر کو دوڑا کے تھکایا ہم نے / کوئی دیں دینِ محمدؐ سا نہ پایا ہم نے
اور دینوں کو جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا / کوئی دکھلائے اگر حق کو چھپایا ہم نے
کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلائے / یہ ثمر باغِ محمدؐ سے ہی کھایا ہم نے
صفِ دشمن کو کیا ہم نے بہ حجت پامال / سیف کا کام قلم ہی سے دکھایا ہم نے
آزمائش کیلئے کوئی نہ آیا ہر چند / ہر مخالف کو مقابل پہ بلایا ہم نے
شانِ حق تیری شمائل میں نظر آتی ہے / تیرے پانے سے ہی اُس ذات کو پایا ہم نے
تیرا میخانہ جو اک مرجعِ عالم دیکھا / خُم کا خُم منہ سے بصد حرص لگایا ہم نے
جب سے یہ نور ملا نور محمدؐ سے ہمیں / ذات سے حق کے وجود اپنا ملایا ہم نے
تیری الفت سے ہے معمور مرا ہر ذرہ / اپنے سینے میں یہ اک شہر بسایا ہم نے
زعم میں اُنکے مسیحائی کا دعویٰ میرا / افترا ہے جسے از خود ہی بنایا ہم نے
کافر و ملحد و دجال ہمیں کہتے ہیں / نام کیا کیا غمِ ملت میں رکھایا ہم نے
گالیاں سن کے دعا دیتا ہوں ان لوگوں کو / رحم ہے جوش میں اور غیظ گھٹایا ہم نے
تیرے منہ کی ہے قسم میرے پیارے احمدؐ / تیری خاطر سے یہ سب بار اٹھایا ہم نے

قوم کے ظلم سے تنگ آ گئے میرے پیارے آج
شورِ محشر ترے کوچہ میں مچایا ہم نے

... علامہ نیاز فتحپوری کی نظر میں

"احمدی جماعت ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے صحیح معنی میں اسلام کی حقیقت کو سمجھا ہے"

"آج روئے زمین کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اگلے انسانات تقدم سے خالی ہو"

"مرزا غلام احمد صاحب نے اسلام کی جانبازانہ مدافعت کی"

"مرزا صاحب کو حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مثیل مسیح، مجدد اور ظلی نبی کہیں"

مجھے سخت افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر احمدیت کے مخالفین مرزا غلام احمد صاحب کی بہت سی ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو انہوں نے کبھی نہیں کہیں خصوصیت کے ساتھ مسئلہ ختم نبوت کہ عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ مرزا صاحب رسول اللہ کو خاتم النبیین نہیں سمجھتے تھے حالانکہ وہ شدت سے اس کے قائل تھے کہ شرعی نبوت ہمیشہ کے لئے رسول اللہ پر ختم ہو گئی اور شریعت اسلام دنیا کی آخری شریعت ہے۔

(رسالہ نگار لکھنؤ [illegible])

علامہ نیاز فتحپوری